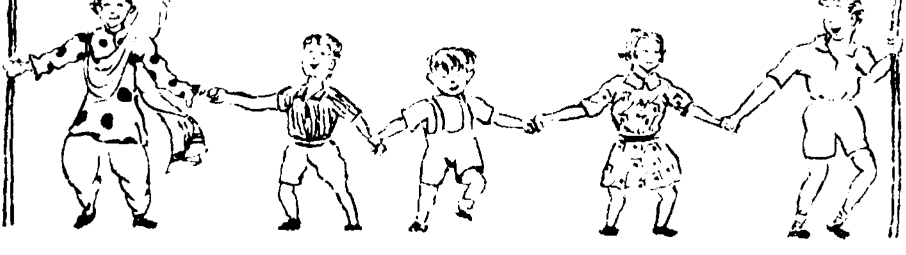
سالگرہ ۱۹۳۶ء

سالگرہ نمبر

از عظمت بخش عظمت متعلم درجہ دہم

جھومتے جھامتے کودتے پھاندتے
ننھے بچے آتے ہیں اور خوشی سے گاتے ہیں
سالگرہ کا دن ہے آج
سالگرہ کا دن ہے آج

شور مچاتے گرد اڑاتے
ناچتے ناچتے آتے ہیں اور خوشی سے گاتے ہیں
سالگرہ کا دن ہے آج
سالگرہ کا دن ہے آج



بچوں سے باتیں

(ایڈیٹر)

لو بھئی خدا خدا کرکے تمہارا پرچہ تیار ہو گیا۔ اب کے ہم نے اس کی تیاری میں پچھلے سال سے بھی زیادہ محنت کی ہے۔ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ بعض باتوں میں یہ پچھلے سال گرہ نمبر سے بڑھ گیا ہے۔ تم اس کا بہت بے چینی سے انتظار کر رہے تھے اور اپنے خطوں سے تم نے ہمارا ناک میں دم کر دیا تھا۔ اب اسے شوق سے پڑھو۔ اور اپنے دوستوں، ہمجولیوں اور اپنی سہیلیوں کو بھی دکھاؤ۔ اگر پڑھنے کے بعد کچھ فرصت ملے تو ہمیں بھی اپنی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کی خبر کرو۔ یہ ضرور بتانا کہ اس مرتبہ اپنے پرچے میں تم کیا کمی محسوس کرتے ہو یہ بھی کہ کون سا مضمون تمہیں زیادہ پسند آیا۔

اس مرتبہ ہم نے کاپیاں اور پروف پڑھنے میں بہت احتیاط سے کام لیا ہے۔ پھر بھی کیا عجب جو غلطیاں رہ گئی ہوں۔ تم پرچے کو اس نظر سے بھی دیکھنا۔ جو بچہ سب سے زیادہ غلطیاں نکالے گا اسے انعام دیا جائے گا۔

اس مرتبہ مضمون ہمارے پاس بہت کافی اور اچھے اچھے آئے اُن کے چننے میں ہمیں بہت دشواری پیش آئی۔ حالانکہ اس مرتبہ ضخامت بھی بڑھا دی گئی یعنی ۴۴ صفحے کر دی گئی۔ پھر بھی کئی اچھے اور دلچسپ مضمون شامل ہونے سے رہ گئے۔ ہمارے محترم دوست شاہ معین الدین احمد صاحب نے کئی سال کے تقاضوں کے بعد مضمون لکھ کر بھیجا تھا۔ سید محمد ادیبا صاحب نے بہت دلچسپ انداز میں ہوائی جہاز کی تاریخ لکھی تھی اور تصویریں بھی بنائی تھیں۔ مرزا سیفی دہلوی نے خاص دلی کی روزمرہ میں بہادر شاہ کے لڑکے شاہزادہ جواں بخت کی شادی کا حال لکھا تھا۔ سید محمد سبزواری صاحب کا پہلا مضمون پیام تعلیم کے معیار سے کچھ بلند تھا تو ہم نے اُن سے دوسرا مضمون ہندوستان کے درختوں پر لکھوایا محترمہ صالحہ عابد حسین صاحبہ نے دو تین اچھے اچھے مضمون خود لکھ کر بھیجے اور اپنی دوسری بہنوں اور سہیلیوں سے لکھوائے۔ بشیر صاحب فیروزپوری نے کئی اچھی اچھی کہانیاں اور معلومات لکھ کر بھیجیں۔ ہمارے خاص کرم فرما پروفیسر اظہر فاروقی نے ایک اچھی کہانی، اور دو ڈرامے عابد حسین مرحوم کے بھیجے بعد میں ایک مضمون سائنس پر بھیجا۔ مولانا الیاس احمد مجیبی صاحب نے اچھی کہانی کے عنوان سے قرآن پاک کا ایک قصہ اپنے انوکھے انداز میں لکھا تھا محترمہ بیگم عبدالغنی صاحبہ نے ہماری درخواست پر بچیوں کے لئے ایک اچھا سا مضمون لکھا تھا۔ رشید الدین صاحب لاہور نے ٹیگور کی ایک کہانی کا ترجمہ کیا تھا ہمیں ان سب بزرگوں بہنوں اور بھائیوں سے بڑی شرمندگی ہے۔ امید ہے کہ ہماری مجبوریوں کو سامنے رکھ کر ہماری معذرت قبول فرمائیں گے [1]

اگر تم پسند کرو تو ہم جنوری میں سال گرہ نمبر کا ضمیمہ نکال دیں اور یہ سب یا ان میں سے اکثر مضمون اس میں شائع کریں۔

اب کی سال گرہ نمبر کے مضمونوں کے انعامی مقابلوں میں کوئی (۵۵) مضمون آئے مضمون لکھنے والے بچوں کے نام یہ ہیں۔

شوکت بخش صاحب جماعت ہشتم خانیوال۔ مریم خاتون علی گڑھ، بشیر احمد صاحب سلطان بازار حیدرآباد۔ میر حسن، فرزند ذاکر حسن۔ حیدرآباد۔ سید عابد حسین عابدی، کانپور۔ مظہر حسین صدیقی آگرہ۔ بشیر احمد فیروزپور شہر۔ حافظ خلیل الرحمٰن بدر، بھوپال۔ تصدق مصطفےٰ شیروانی۔ مرزا محسن علی، المورہ حسنہ بیگم میرٹھ شہر۔ امان اللہ خاں بھوپال۔ محمد معین الدین خاں رانچی۔ اصغر حسین، ہزارہ باغ لکھنؤ۔ ایم یوسف نسیم نوشہری، بہاولپور۔ محمد عمران۔ فتح گڈھ۔ محمد عثمان الرحمٰن صدیقی فیض عام ہائی اسکول۔ میرٹھ۔ موسیٰ قادری۔ حیدرآباد۔ شیخ سرشار علی، علی گڑھ۔ اقبال احمد اقبال۔ امروہہ عقلمند بخش، خانیوال۔ ابو الکلام، ادے پور میواڑ۔ محمد یحییٰ انصاری بھوپال بشیر احمد، فیروزپور شہر۔ ضیاء الرحمٰن اعظمی ندوہ لکھنؤ۔ سید یاد علی فرخ آباد۔ اسد، پربھنی حیدرآباد۔ زہرا خاتون دہلی۔ میاں خورشید الدین کاکاخیل۔ عبدالوارث درجہ ہفتم الہ آباد۔ فرحت علی عرف حسنات طالب علم آنولہ ضلع بریلی۔ ثریا بنت زاہد حسین گلمرگ کشمیر۔ عمر کامل صاحب دہلی۔ سید ولی پیران چیلارگ میسور۔ سید نقی اشرف۔ اعظم گڈھ۔ صالحہ خاتون۔ صلاح الدین خاں۔ لدھیانہ، پنجاب۔ سید صاحب پیران چیلدرگ۔ نور الدین محمد آباد۔ گوہنہ اعظم گڈھ۔ محمد فخر الدین احمد، بیڑ حیدرآباد دکن۔ کافی جیراجپوری ندوہ لکھنؤ۔ اسرار راجہ پوری شبلی ہوسٹل۔ لکھنؤ۔ سعیدہ خانم بنت محمد سلیمان آدمی وکیل بانسی محمود علی خیریت آباد۔ سید ناصر الدین حیدرآباد دکن۔

---

[1] جناب آل احمد صاحب سرور نے ہماری درخواست پر الورسٹ پر بہترین مضمون لکھا تھا افسوس ہے کہ اس کی تصویریں وقت پر نہ پہنچ سکیں اور یہ چھپنے سے رہ گیا

پیامِ تعلیم

ایڈیٹر محمد حسین حسان ندوی جامعی

قیمت سالانہ عہ ، فی پرچہ ۳ر ، سال گرہ نمبر ۱۲ر

جلد ۱۹	نومبر - دسمبر ۱۹۳۶ء	نمبر ۱۱، ۱۲

فہرست مضامین سال گرہ نمبر

پرنٹر و پبلشر ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ام اے، پی ایچ ڈی - جامعہ پریس

سید عبدالعلی حسنی لکھنؤ۔ عبدالرشید خاں رشدی بھوپال۔ سید شاہ بلیغ الدین مین فونگل کالج حیدرآباد۔ اعظمی۔ پورہ میران سیالکوٹ شہر سید ذکی احمد ہاشمی سندیلہ، ہردوئی۔ محمد اسحاق جعفر جالنہ حیدرآباد محمد اشفاق صدیقی۔ مدرسہ فوقانیہ عثمانیہ جالنہ (دکن)، رام گوپال جیسوال مدرسہ فوقانیہ عثمانیہ جالنہ (دکن) ملک فضل امام مظفری فطرت عظیم آباد سید حسن محمود خلف سید فاروق اعظم گوپال گنج سارن۔ زہرا خاتون بنت خواجہ غلام سبطین صاحب پانی پت۔ سید کلیم حامد رضوی۔ محمد اسحاق پشاوری۔ محمد اسلم صدیقی فتح گڑھ یوپی تابر محمد خاں بنگش فرخ آباد۔ اقبال الدین صدیقی۔ سید آفتاب عالم عاصی بل بنگش دہلی ہمشیرہ سید حامد علی۔ سید طہیر الدین۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن قمر الحسن عرف فرخ میاں۔ قائم گنج۔ سید ابوالحسن حیدرآباد دکن۔

ان میں محمد عمران فتح گڑھ اول۔ عبدالوارث مجیدیہ اسلامیہ ہائی اسکول الہ آباد، دوم اور محمد کامل دہلی سوم آئے۔ ہمارا ارادہ تھا کہ ان میں سے چند مضمون اس پرچے میں شائع کریں گے مگر گنجائش کی کمی کے سبب اس کی نوبت نہ آئی۔ انشاء اللہ اگلے پرچوں میں شائع کرتے جائیں گے۔

اس سال ہم نے بچیوں کے لئے الگ انعام رکھا تھا۔ بچیوں کے کل ۱۰ مضامین آئے مضمون لکھنے والی بچیوں کے نام یہ ہیں:-
مریم خاتون علی گڑھ۔ حسنہ بیگم میرٹھ۔ ثریا بنت زاہد حسین گلمرگ امۃ الزہرا بیگم۔ پانی پت۔ درۃ البیضا بیگم۔ پانی پت۔ صالحہ خاتون۔ سعیدہ خانم۔ زہرا خاتون پانی پت۔ ہمشیرہ سید ساجد علی صاحب

ان میں ہمشیرہ سید ساجد علی صاحب کو پہلا انعام اور صالحہ خاتون کو دوسرا انعام دیا جائے گا۔

سال گرہ نمبر کے لطیفوں کے انعامی مقابلے میں ان بچوں نے لطیفے بھیجے:-
سید نقی اشرف دسنوی اعظم گڈھ۔ زہرا خاتون۔ شوکت بخش خانیوال۔ محمود علی حیدرآباد۔ عبدالمالک کلکتہ۔ ط۔ ب، بنت سید یاد علی چھپرا مئو۔ قدیر احمد خاں صاحب فرخ آباد۔ محمد افضل بہاولپور ملک ولی امام مظفری عظیم آبادی۔ زہرا خاتون۔ پانی پت۔ محمد عمران فتح گڈھ سری نواس آچاری گلبرگہ شریف۔ ہاجرہ خاتون لشکر گوالیار۔ اعزاز حسین بریلی۔ میرزا اکرم حسن حیدرآباد۔ مجیب الرحمٰن کھگڑیہ۔ سید احمد علی پونہ محمد نجیب اشرف بنگش پھلواری۔ رفیق احمد مڈل اسکول فتح پور بارہ بنکی۔ راد ھے شیام نگم پرائمری اسکول فتح پور، بارہ بنکی۔ محمد حسین مدرسہ فتح پور۔ بارہ بنکی۔ شیو برن لال مدرسہ فتح پور۔ بارہ بنکی رام چندر لال مدرسہ فتح پور۔ بارہ بنکی۔ سید محمد ابوالقاسم شمشی اورنگ آباد (گیا) سید محمد ثقلین نگینہ بجنور۔ محمد یحییٰ انصاری۔ بھوپال۔ ایم یوسف نسیم نوشہری بہاولپور۔ محمد احمد علی القادری۔ رائچور۔ عبدالاحد خاں مغل سرائے۔ صلاح الدین خاں لدھیانہ۔ فضیل الرحمٰن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ محمد ابراہیم ولد محمد جمال الدین۔ گلبرگہ۔ سید صبغۃ اللہ فاطمی شملہ۔ مریم خاتون۔ علی گڑھ۔ ابن الحسن۔ بلند شہر۔

ان میں سید نقی اشرف اعظم گڈھ کے لطیفے زیادہ پسند کئے گئے اس کے بعد زہرا خاتون کے اور پھر شوکت بخش خانیوال کے۔ ان تینوں کو انعام بھیج دئے جائیں گے۔

"ماڈل" کے انعامی مقابلے میں ان بچوں نے حصہ لیا۔
محمود علی حیدرآباد۔ ابوالکلام، رفیق احمد شملہ۔ زہرا خاتون پانی پت۔ احمد علی۔ نذیر محمد نصیر آباد۔ عثمان الرحمٰن خیر نگر خلیل عمر اورئی ضلع جالون۔ اقبال احمد اقبال امروہہ۔ فطرت مظفری پٹنہ سید ابوالحسن ان میں ابوالکلام اول۔ رفیق احمد دوم اور خلیل عمر سوم آئے

رنگ بھرنے کی تصویر کے انعامی مقابلے میں ان بچوں نے حصہ لیا۔ میرزا اکرم حسن حیدرآباد دکن۔ سید صاحب پیران چلدرگ۔ غلام یزدانی حیدرآباد۔ محمد عبدالوالی حیدرآباد۔ محمد شعیب قریشی رام پور۔ یوسف علی خاں اسد حیدرآباد۔ ثریا رفعت خانم پشاور سید محمد ثقلین زیدی نگینہ خورشید حسن فتح پور، بارہ بنکی، زہرا خاتون پانی پت۔ سید ضیاء الاسلام۔ دہرہ دون۔ ملک علی امام گیا۔

ان میں غلام یزدانی اول۔ زہرا خاتون دوم اور سید صاحب پیران سوم آئے۔

محترمہ آپا جان نے چند تصویریں بھیجی ہیں۔ چڑیا گھر والی

تصویروں کی طرح یہ بھی عکس اتارنے کے بعد بنائی جائیں گی۔ تصویریں کیا ہیں ایک اچھا خاصا عجائب خانہ ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ تم بہت شوق اور دلچسپی سے انھیں بناؤ گے۔ ان تصویروں کا سلسلہ جنوری سے شروع ہوگا۔

آپا جان نے خط کتابت کے سلسلے میں ہمیں دو خط بھی بھیجے ہیں۔ انھوں نے عزیزہ شاہجہاں کے خط کا جواب دیا ہے اور لکھا ہے کہ تم نے کپڑے پر ہندوستان کا نقشہ بنایا ہے۔ بہت اچھی بات ہے مگر ہمیں ایسی ڈرائنگ کی ضرورت ہے جو کاغذ پر ہو۔ دوسرے خط میں انھوں نے بتایا ہے کہ جرمنی کے ۹ سے ۱۴ سال تک کے بچے ہندوستان کے ایسی عمروں کے بچوں سے مختلف باتوں کے متعلق خط کتابت کرنا چاہتے ہیں۔ جو بچے انھیں خط لکھنا چاہیں۔ وہ پہلے اپنا نام، عمر، پتہ، اپنے والد کا نام اور پیشہ لکھیں اور پھر خط چاہے اردو میں لکھیں یا انگریزی میں۔ لیکن اوپر والی چیزیں خانے کھینچ کر انگریزی ہی میں لکھیں یا لکھوالیں۔ یہ دونوں خط جنوری کے پرچے میں شائع ہوں گے

ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کے بچوں میں خط کتابت کے لئے پیامی بچوں کی ایک انجمن بنائیں۔ یہ بہت مفید مشغلہ ہے اور بچوں کو اس سے بہت سی باتوں میں مدد ملتی ہے۔ ٹکٹ جمع کرنے کے سلسلے میں پیامی بچوں میں خط کتابت کا سلسلہ عرصے سے جاری ہے اور اس سے بہت مفید نتیجہ نکلا ہے۔ اب ضرورت ہے کہ اسے انجمن کی شکل دے دی جائے۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل ہو۔ اس کے بارے میں اپنی رائے سے جلد مطلع کرو۔ یہ بھی بتاؤ کہ اس کا نام کیا رکھا جائے۔ کثرت رائے پر فیصلہ ہوگا۔ یہ کام جنوری سے شروع کر دینا چاہتے ہیں

انعامی مقابلے کے مضامین میں جو پیام تعلیم میں چھپنے کے قابل ہیں وہ رکھ لئے گئے ہیں باقی اصلاح کے بعد واپس کئے جا رہے ہیں۔ ہم نے اس کا خاص انتظام کیا ہے کہ اس قسم کے مضمون اصلاح و مشورے کے بعد واپس کر دئے جائیں۔

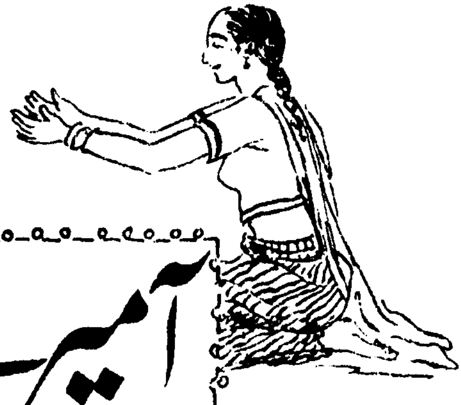
اس مرتبہ خط کتابت اور معلومات کے لئے بھی گنجائش نہ نکل سکی۔ انشاء اللہ اگلے پرچے سے ان کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہو جائے گا۔

سال گرہ نمبر کی مصروفیت اور دوگار ایڈیٹر صاحب کی بیماری کی وجہ سے بہت سے بچوں کے خطوں کے جواب دیر میں دئے جا سکے ویسے تو ہمیشہ اس کا خیال رکھا جاتا ہے کہ ہر بچے کے خط کا جواب فوراً دیا جائے۔ مگر اب اس کا خاص انتظام ہو گیا ہے۔ انشاء اللہ اب کسی بچے کو شکایت نہ ہوگی۔

جنوری سے پیام تعلیم کے لئے خاص انتظامات ہوئے ہیں مارچ میں ہمارا ارادہ ہے کہ نظام نمبر شائع کیا جائے حیدرآبادی بچے خاص طور پر اپنے مضمون بھیجیں۔ ہر مضمون پر استاد کی تصدیق اور پورا پتہ ہونا چاہئے۔ بعض بچے تصویروں پر اپنا نام نہیں لکھتے اس سے بڑی دقت ہوتی ہے اور تصویریں یا مضمون مقابلے میں شامل نہیں ہو سکتے۔ بچوں کو اس کا خاص طور سے خیال رکھنا چاہئے۔

اس پرچے کی تیاری میں مضمون لکھنے والے حضرات کے علاوہ سید محمد بابا صاحب سے بہت مدد ملی اس پرچے کا ٹائٹل اور لیتھو کی قریب قریب سب تصویریں اُن ہی کی بنائی ہوئی ہیں۔ اس پرچے کے لئے انھوں نے مضمون بھی لکھے اور کئی مضمونوں کی تیاری میں انھوں نے مدد بھی دی۔ ہمارے ایک اور محترم بزرگ ہیں جن کا نام نہ تو ہم خود لینا چاہتے ہیں اور نہ وہ اسے پسند کریں گے۔ مگر اتنا تمھیں بتا دیں کہ ان کی رہنمائی اور امداد کے بغیر پرچے کو ہرگز کامیابی نصیب نہ ہوتی ہم جناب خاں صاحب عبداللطیف خاں صاحب کے بھی بہت احسان مند ہیں کہ انھوں نے اپنے جامعہ پریس میں ہمیشہ کی طرح اب کے بھی بہت توجہ سے پرچہ اور اس کی تصویریں چھپوائیں۔ اچھا اب رخصت! اللہ نے چاہا تو اب جنوری میں ملاقات ہوگی۔ دسمبر میں پرچے کا انتظار نہ کرنا۔





آ میرے چاند آجا

ازجناب مولوی محمد شفیع الدین صاحب جامعی اُستاد ماڈرن ہائی اسکول نئی دہلی

آ میرے چاند! آجا تیری بلائیں لوں میں
تیری بلائیں لوں میں، تجھ کو دعائیں دوں میں

کیا بھولی بھولی صورت، تجھ کو خدا نے دی ہے
کیا پیاری پیاری مورت، پیارے تجھے ملی ہے

ماں باپ کا کھلونا، گھر بھر کا کھیل ہے تو
اس گھر کے باغ میں اِک نوخیز بیل ہے تو

ہو کیوں نہ تجھ سے ٹھنڈا ماں باپ کا کلیجا
کیا دلبری سکھا کر تجھ کو خدا نے بھیجا

آنکھوں کی روشنی ہی تو ہے چراغ سب کا
کلکاریوں سے تیری، دل باغ باغ سب کا

یہ آرزو ہے میری، پروان تو چڑھے اب
علم و ہنر کے درجے محنت سے طے کرے سب

دُکھ بھی اگر اٹھائے، ماتھے پہ بل نہ آئے
ہمت کبھی نہ ہارے کوشش کیے ہی جائے

سائنس میں ادب میں پائے کمال پورا
جو کام بھی کرے تو چھوڑے نہ وہ ادھورا

تن ہو ترا توانا، اور بازوؤں میں بل ہو
اخلاق اور ادب کے وصفوں میں بے بدل ہو

صدیق(۱) کی صداقت، فاروق(۲) کی عدالت
عثمان(۳) کی سخاوت، شیرِ خدا(۴) کی جرأت

خلق محمدی کا دنیا میں ہو نمونہ
تو آخری نبی کا دنیا میں ہو نمونہ

مقبول ہو خدایا نیّر کی ہے دعا یہ
پھولے پھلے یہ بچہ، پورا ہو مدعا یہ

---

(۱) حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفۂ اول

(۲) حضرت عمر فاروقؓ خلیفۂ دوم

(۳) حضرت عثمان غنیؓ خلیفۂ سوم

(۴) حضرت علی شیرِ خدا کرم اللہ وجہٗ خلیفۂ چہارم

ہمارِی زبان

ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب استاد جامعہ

ہم دوسرے سے کوئی بات کہنا چاہتے ہیں یا اس سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں تو یا تو اشاروں سے کام لیتے ہیں، یا لفظوں سے۔ اشاروں کے ذریعے سے بہت کم باتیں پوچھی اور کہی جا سکتی ہیں یا ہاتھ کے اشارے سے ہم کسی شخص سے یہ پوچھ سکتے ہیں کہ تم کہاں جا رہے ہو اور وہ بتا سکتا ہے کہ میں اس طرف جا رہا ہوں لیکن اگر یہ پوچھنا ہو کہ تم جمعے کو کہاں کہاں گئے تھے، کون کون سی چیزیں دیکھی تھیں کن کن لوگوں سے ملے تھے۔ کیا کیا باتیں ہوئی تھیں۔ تو ہم یہ سب نہ دوسرے کو اشاروں میں سمجھا سکتے ہیں اور نہ وہ اشاروں میں جواب دے سکتا ہے۔ اس کے لئے لفظوں کی ضرورت ہے۔ جہاں کہیں لوگ مل جل کر رہتے ہیں۔ وہ سب چیزوں کے اور خیالوں کے نام رکھ لیتے ہیں جنھیں لفظ کہتے ہیں اور یہ سب لفظ مل کر زبان کہلاتے ہیں۔ سب ملکوں کی زبانیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ مگر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک زبان کئی ملکوں میں بولی جاتی ہے یا ایک ہی ملک کے لوگ کئی زبانیں بولتے ہیں۔

ہمارے ہندوستان میں بہت سی زبانیں ہیں۔ مگر ایک زبان تھوڑے تھوڑے فرق سے ملک کے بہت بڑے حصے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور ہندوستانی کہلاتی ہے یہ زبان شمالی ہندوستان کی پرانی زبانوں سے نکلی ہے۔ اور اس میں تھوڑا سا میل فارسی

عربی سنسکرت اور دوسری دیسی اور بدیسی زبانوں کا بھی ہے۔ اب سے ساڑھے پانچ سو سال پہلے دکن میں اور پھر شمالی ہندوستان میں پڑھے لکھے ہندو مسلمان اس زبان میں کتابیں لکھنے لگے۔ انھوں نے اس کو بہت ترقی دی اور آگے چل کر اس کا نام اردو رکھا

ہماری زبان یہی اردو ہے۔ قریب قریب سارے ہندوستان میں مسلمان اور دکن اور شمالی ہند میں بہت سے ہندو اردو لکھتے اور بولتے ہیں۔ اردو اور ہندوستانی میں یہ فرق ہے کہ اردو میں عربی فارسی کے لفظ زیادہ ہیں اور ہندوستانی میں کم اردو صرف فارسی حروف میں لکھی جاتی ہے۔ اور ہندوستانی فارسی اور ناگری دونوں میں۔ اردو زیادہ تر پڑھے لکھے لوگوں کی زبان ہے ہندوستانی کو ملک کے بہت بڑے حصے میں پڑھے بے پڑھے بولتے اور سمجھتے ہیں۔ ہندوستانی اور سنسکرت کے میل سے ایک اور زبان بنی ہے جو ہندی کہلاتی ہے اور ناگری حروف میں لکھی جاتی ہے۔

ہماری اردو زبان کی عمر کوئی ساڑھے پانچ سو سال کی ہے۔ اتنے دنوں میں ہمارے ہندو مسلمان بزرگوں کی کوششوں سے یہ زبان ایشیا کی بڑی زبانوں میں گنی جانے لگی ہے۔ اس میں بڑے بڑے ہندو مسلمانوں کی مذہبی کتابیں اور شعر اور ادب کی بڑی بڑی کتابیں موجود ہیں۔ علم اور فن کی تصنیفیں اور ترجمے اردو میں جاپانی کے سوا ایشیا کی کسی زبان سے کم نہیں۔ ہاں یورپ کی بڑی زبانوں کا مقابلہ ہماری زبان اب تک نہیں کر سکتی۔ اگر ہمیں اپنی زبان پیاری ہے تو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ وہ برابر ترقی کرتی رہے۔ یہاں تک کہ دنیا کی کسی زبان سے ہیٹی نہ رہے۔

شاید کوئی یہ پوچھے کہ ہم اپنی زبان کو ترقی دینے کی کوشش کیوں کریں اور کیسے کریں؟

کیوں کریں؟ اس کا جواب تو یہ ہے کہ زبان ہماری جان ہے۔ ہمارے جسم کی نہیں

بلکہ ہمارے ذہن کی۔ اسی کے بل پر ہمارا ذہن جیتا ہے۔ اس کے پنپنے سے پنپتا ہے اس کے کھلانے سے کھلتا ہے۔ ذہن کسے کہتے ہیں؟ وہ قوت جس سے ہم دنیا کو جانتے اور سمجھتے ہیں۔ دنیا کو جاننا، سمجھنا ایک آدمی کا کام نہیں۔ بہت سے آدمی مل کر دنیا کو دیکھتے ہیں دیکھے ہوئے کو سوچتے ہیں اور اپنے خیالات ایک دوسرے کو بول کر یا لکھ کر بتاتے ہیں۔ اس کے لئے لفظوں کی یعنی زبان کی ضرورت ہے۔ اگر کسی زبان میں کافی اور اچھے لفظ موجود نہیں ہیں جن کے ذریعے سے اس کے بولنے والے اپنے خیالات ایک دوسرے پر ظاہر کریں تو ہر شخص کے خیالات اسی تک رہتے ہیں نہ وہ اپنی کہہ سکتا ہے نہ دوسرے کی سن سکتا ہے۔ اس کا علم بہت تھوڑا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی اولاد کو بھی نہیں پہنچتا، سوچنے کی بات ہے کہ جب تک زبان ترقی نہ کرے علم کیوں کر ترقی کر سکتا ہے۔ جن لوگوں کی زبان سب زبانوں سے پیچھے ہوتی ہے وہ علم و فن میں بھی سب سے پیچھے ہوتے ہیں۔ کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ اگر ہماری زبان علم سے خالی ہے تو ہم کوئی دوسری زبان سیکھ کر اس کے ذریعے سے علم حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ بات کچھ کچھ تو ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔ اُس کی مثال ہندوستان میں ہمارے سامنے ہے۔ ہندوستان والے جن کی زبانیں بہت پیچھے ہیں۔ انگریزی کے ذریعے سے علم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ مگر دوسری زبان کا سیکھنا اتنا مشکل ہوتا ہے کہ بہت تھوڑے لوگ سیکھ سکتے ہیں۔ جو سیکھتے بھی ہیں اُن کا بیشتر زمانہ اسی زبان کے سیکھنے میں گذر جاتا ہے۔ علم حاصل کرنے کا وقت ہی نہیں رہتا اور پھر سب جتن کرنے کے بعد بھی دوسری زبان اتنی نہیں آتی کہ آدمی اپنے دل کی ہر بات۔ اپنے ذہن کا ہر خیال اس میں اچھی طرح ادا کر سکے اور اس کے بولنے اور لکھنے میں کمال حاصل کر سکے۔ دیکھو ہمارے دیس میں کئی لاکھ آدمیوں نے دس دس بیس بیس برس انگریزی سیکھی۔ کئی ہزار آدمی انگلستان میں رہ کر آئے مگر اُن میں کتنے ہیں جو

انگریزی میں شعر کہہ سکیں یا نثر میں اچھی اچھی کتابیں لکھ سکیں۔ ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جنھوں نے بہت علم حاصل کیا ہے مگر ان کا علم گونگے کا سا ہے کہ آپ ہی آپ اس کا مزہ لیتے ہیں پر بھائیوں کو کچھ نہیں بتا سکتے۔ بہت سے لوگوں کو تو یہ دعویٰ ہے کہ انگریزی کی دھن میں انھوں نے اپنی زبان کی طرف بالکل توجہ نہیں کی۔ وہ اردو میں بات چیت کر لیتے ہیں۔ مگر جب کسی علمی مسئلے کی یا ملکی معاملے کی بحث ہو تو زبان کھول سکتے ہیں نہ قلم اٹھا سکتے ہیں کچھ کہتے ہیں یا لکھتے ہیں تو انگریزی میں جسے بس تھوڑے ہی سے آدمی سمجھ سکتے ہیں۔ ان کے ذہن میں اچھے اچھے خیالات آتے ہیں اور اُن کا جی چاہتا ہے کہ اپنے دیس کے لاکھوں کروڑوں آدمیوں کو باتیں سنائیں۔ مگر گھٹ کر رہ جاتے ہیں اگر کبھی گونگوں کی طرح کچھ آوازیں نکالتے بھی ہیں تو کوئی نہیں سمجھتا۔

ایک بات تو معلوم ہو گئی کہ اپنی زبان کو ترقی دینا بہت ضروری ہے۔ اب دوسری بات یہ ہے کہ اسے ترقی کس طرح دی جائے؟

تو بھی ہم سب لوگوں کو جو مدرسے میں پڑھتے ہیں سب سے پہلے یہ کرنا چاہیے کہ اپنی زبان اچھی طرح سیکھیں۔ اردو کے گھنٹے میں اونگھنا یا کاپی پر اپنی یا اپنے دوستوں کی تصویریں بنانا چھوڑ دیں۔ بلکہ خوب چوکس ہو کر سنیں کہ استاد کیا کہہ رہا ہے اور پڑھیں کہ کتاب میں کیا لکھا ہے۔ گھر پر کرنے کو جو کام دیا جائے اسے پابندی سے اور محنت سے یہ سمجھ کر کریں کہ یہ زبان کا کام ہے جو ہماری جان ہے۔ اسی سے ہمارے اور ہماری قوم کے علم کی ترقی ہوگی اور علم کی ترقی میں قوم کی بھلائی ہے اسی سے ہماری قوم دوسری قوموں کی برابری کرے گی آزادی، دولت اور عزت حاصل کرے گی مدرسے کی کتاب کے علاوہ ہمیں استاد سے اور اپنے بڑوں سے پوچھ کر اردو کی اچھی اچھی کتابیں پڑھنی چاہئیں۔ بہت سی کتابیں تو ہمیں اپنے گھر میں یا مدرسے کے کتب خانے میں مل جائیں گی، پھر رسالوں میں اخباروں میں

...... کتب فروشوں کی فہرستوں میں۔ بچوں کی کتابوں کے اشتہار نکلتے ہیں انھیں پڑھ کر ماں باپ سے ضد کرنی چاہیئے کہ ہمیں فلاں کتاب منگا کر دو۔ اس کے لئے تو ہم سب مچلتے ہیں کہ ہمیں مٹھائی منگا دو۔ کپڑے بنا دو تماشا دکھا دو۔ مگر ایسے ہم میں بہت کم ہیں جو کتاب کے لئے مچلتے ہوں۔ یقین ہے کہ بہت سے ماں باپ ہمیں بڑی خوشی سے کتاب منگا کر دیں گے۔ وہ انکار کریں تو ہیں کے دو سبب ہو سکتے ہیں یا تو اُن کے پاس پیسہ نہیں یا انھیں کتابوں کا شوق نہیں۔ اگر پیسہ نہیں تو صبر کرنا چاہیئے اور کتب خانے سے یا دوستوں سے مانگ کر کتابیں پڑھنی چاہئیں۔ اگر شوق نہیں تو اُن کے پیچھے پڑ جانا چاہیئے۔ کبھی نہ کبھی انھیں شوق پیدا ہو ہی جائے گا۔

جب ہم اپنی زبان اچھی طرح سیکھ لیں گے تو پھر اور کام کرنے کا وقت آئے گا۔ پھر ہم اچھی اچھی کتابوں کا دوسری زبانوں سے اردو میں ترجمہ کریں گے۔ خود اچھے اچھے مضمون اور بڑی بڑی کتابیں لکھیں گے۔ دنیا کے ہر علم و فن کو اردو میں لے آئیں گے اور ایک دن بڑے فخر سے یہ کہیں گے کہ ہماری زبان دنیا کی کسی زبان سے ہیٹی نہیں۔ چاہے وہ جرمن ہو یا فرانسیسی یا انگریزی۔ وہ دن ہمارے لئے اور ہماری قوم کے لئے کیسی خوشی کا دن ہو گا!



بھالو

از ہاجرہ بیگم صاحبہ

محترمہ ہاجرہ بیگم نے ہماری درخواست پر یہ اچھا سا ڈرامہ یا نقل بھیجی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ بچے اس نقل کو ایکٹ کریں گے۔ اور اپنی کامیابی کی ہمیں اطلاع دیں گے۔ (ایڈیٹر)

ہمارے یہاں پہلے محفلوں اور جلسوں میں ایک بڑی دلچسپی کی چیز ہوا کرتی تھی اسے نقل کہتے تھے نقال یعنی نقل کرنے والے کسی روز مرہ کی بات کی مزے دار تصویر کھینچا کرتے تھے۔ رئیس آدمی انھیں بڑی بڑی رقمیں دے کر بلاتے تھے اور غریب لوگ چندہ اکٹھا کر کے دیتے تھے۔ ان نقالوں کی ٹولیاں ہوتی تھیں۔ عورتوں کی الگ، مردوں کی الگ یہ لوگ آپس میں مل کر کھیل کی تھوڑی سی مشق کر لیتے تھے۔ لکھے ہوئے لفظ تو ہوتے نہ تھے، بس کچھ سوال و جواب زبانی یاد کر لیتے تھے اور کچھ باتیں موقع پر جی سے ملاتے جاتے تھے۔ کھیل کرنے کے لئے اسٹیج یعنی کوئی خاص جگہ نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ محفل کے بیچوں بیچ لوگ جگہ چھوڑ دیتے تھے یہ لوگ سوانگ بھی بھرتے تھے یعنی طرح طرح کے مناسب لباس پہنتے تھے۔ نقلی داڑھی، مونچھ اور بال لگاتے تھے۔ منہ پر آٹا سرخی اور کالک بھی ملتے تھے۔ کبھی کبھی بنے ہوئے چہرے لگاتے تھے ان نقلوں میں گانا کم ہوتا تھا اور زبان بھی روزمرہ کی آسان زبان ہوتی تھی۔ اس قسم کی نقلیں ہر ملک میں اور ہر زبان میں ہوتی تھیں اور آج کل کے ڈراما اور تھیٹر کی یہ ابتدا تھیں

بھالو والے کی نقل میں چھوٹے بچوں کے

لئے لکھی ہوں۔ اگر ننھے بچے اس کو یاد کر لیں اور ایکٹ کریں تو بہت مزے دار ہوگی۔ کمرے میں یا کھلے میدان میں کر سکتے ہیں۔ جتنے بچے چاہیں شریک ہو جائیں۔ کم از کم سات بچے ہونے چاہئیں۔ اگر زیادہ ہیں تو تینوں بچوں کا پارٹ بانٹ کر ایک ایک دو دو جملے سب لے سکتے ہیں

بھالو کی نقل

تماشہ کرنے والے :۔

مداری (سب سے ہوشیار لڑکا)۔ گیروا دھوتی لال کرتا۔ سر پر لنگی لپٹی ہوئی، لمبے لمبے پٹھے (بال) لٹکتے ہوئے، ننگے پاؤں کانوں میں بالے، گلے اور ہاتھوں میں کنٹھے، اور مالائیں لپٹی ہوئیں۔ ایک ہاتھ میں لوہے کا کڑا، کندھے پر بڑا سا تھیلا۔ ایک ہاتھ میں ڈگڈگی۔ اور ایک میں ڈنڈا۔

بھالو کسی بچے کے اوپر بڑا سا بالوں والا کوٹ ڈال کر بنایا جا سکتا ہے۔ منہ چاہیں ڈھانپ دیں۔ چاہے کپڑے یا کاغذ کا چہرہ بنا کر لگا دیں۔

ماں۔ (کوئی بڑی لڑکی بن سکتی ہے) رنگین ساڑھی اور کرتا پہنے ہوئے۔ تھوڑا سا زیور اور ایک بڑے سے رومال میں کنجیاں اور پیسے بندھے ہوئے

ماما۔ (موٹی سی لڑکی) تنگ پاجامہ اور سفید کرتا اور دوپٹہ، پھٹی ہوئی جوتیاں، چاندی کی بالیاں اور چوڑیاں، بال بکھرے ہوئے۔

منّی:۔ (سب سے چھوٹی لڑکی) گلابی کرتا اور بڑا پاجامہ پہنے ہوئے، بڑی صدری ہے سر پر گول ٹوپی اور کانوں میں بُندے۔

بچے۔ چھوٹے بڑے لڑکے اور لڑکیاں

سین :۔

اسٹیج کے بیچ میں پلنگ یا کرسی بچھی ہے، "ماں" بیٹھی سی رہی ہے۔ کچھ بچے داہنی طرف بیٹھے گڑیاں کھیل رہے ہیں۔ ایک بڑا بچہ کرسی پر بیٹھا کتاب پڑھ رہا ہے۔ بچوں کے آپس میں

بولنے کی آوازیں آرہی ہیں۔

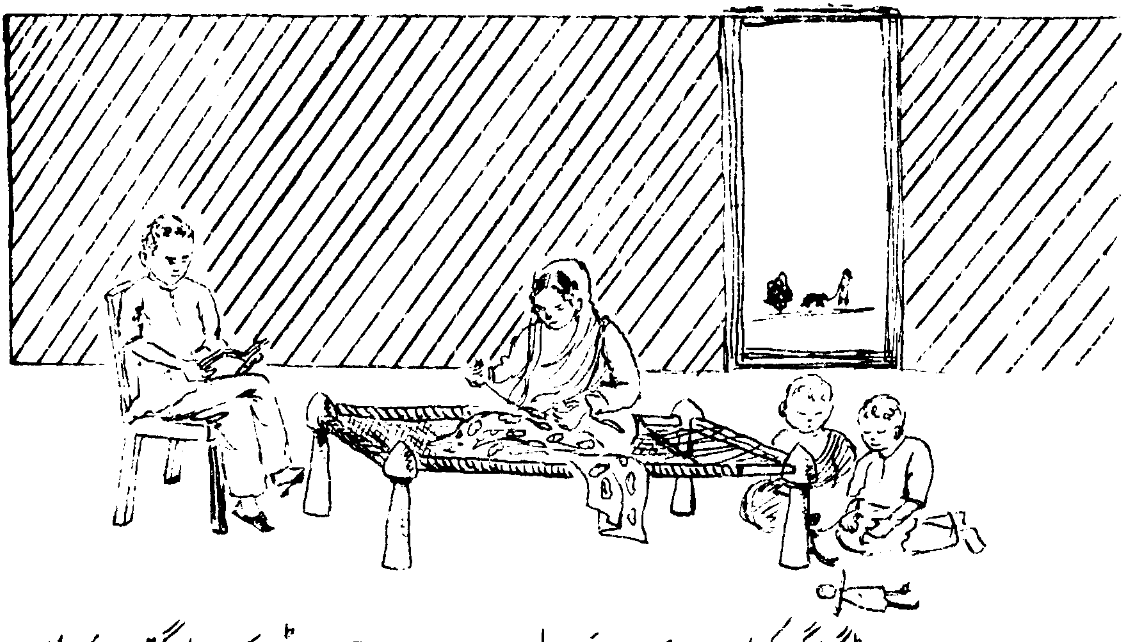
"لاؤ ہمیں دو۔"

"واہ یہ ہمارا ہے۔"

"کیا کرتی ہو۔"

کی طرف دوڑتے ہیں۔ کچھ باہر نکل جاتے ہیں۔ کتاب پڑھنے والا اپنی کتاب بند کر دیتا ہے ......

بچے دل کر، "بھالو والا! بھالو والا!"



...... ڈگڈگی کی آواز سنائی دیتی ہے۔ داہنے ہاتھ پر بیٹھے ہوئے بچوں میں سے ایک دوڑ کر جاتا ہے اور دروازے میں سے جھانک کر دیکھتا ہے ......

پہلا بچہ۔ بھالو والا! بھالو والا!

...... سب بچے اٹھ کر دروازے

...... چھوٹے بچے بھاگتے ہوئے ماں کے پاس آتے ہیں ......

دوسرا بچہ" اماں بھالو والے کا تماشہ کرا دیجئے"

تیسرا بچہ:۔ ہاں اماں۔ بہت دن سے تماشہ نہیں دیکھا۔

ماں "اوں، ہوں۔ اب روز تماشے ہونے

گے۔ جاؤ کھیلو۔ مجھے سینے دو"

دونوں بچے مچل کر۔ اوں، اوں، اماں

ہم تو تماشہ دیکھیں گے۔

...... اور بچے بھی ماں کو آن کر

گھیر لیتے ہیں ......

سب بچے۔ "ہم تو تماشہ دیکھیں گے"

اماں کروا دیجئے نا"

"خالہ بی ہم نے کبھی تماشہ نہیں دیکھا ہے"

ماں: (ماتھے پر بل ڈال کر) اچھا

خیر آج بلالو۔ مگر پھر کل

پرسوں کو ضد نہ کرنا"

...... بچے سب داہنے

ہاتھ کو دوڑ کر جاتے ہیں اور پکارتے ہیں۔

بھالو والے۔ او بھالو والے۔ یہاں آؤ"

...... مداری بھالو کو لئے آتا ہے

سب بچے اس سے ڈر کر پیچھے کو ہٹ جاتے ہیں

مداری "سلام حجور کیا کچھ کھیل ہوگا۔ کچھ تماشہ

کرتب دکھلاؤں"

بچے۔ ہاں، ہاں، تماشہ دکھاؤ۔

..... بچے سب ماں کے اودھر ادھر

بیٹھ جاتے ہیں۔ ماما منّی کی انگلی پکڑے آتی

ہے۔ اور داہنی طرف کھڑی ہو جاتی ہے۔

مداری اپنا جھولا زمین پر رکھ دیتا ہے۔ لکڑی

اور بھالو کی نکیل کو پاؤں سے دبا کر بائیں طرف

بیٹھ جاتا ہے۔ پھر ڈگڈگی بجا کر گا گا کر کہتا ہے۔

مداری۔ چل میاں سلام کر۔ بڑے حجو کو

سلام کر۔ جرا بٹیا چال دکھا اپنی ....

.... بھالو جا کر سب کے سامنے

سر ٹیکتا ہے



مداری "اور بٹیا کیسے بیٹھو گے چوکی پر کیسے بیٹھو گے"

...... ڈگڈگی رکھ دیتا ہے۔ بھالو اس پر بیٹھ جاتا ہے

مداری "اور چرکھا کیسے کاتے گی مالک کا چرکھا کاتے گی"

..... بھالو چرخہ کاتتا ہے۔

مداری۔ "شاباش بیٹے۔ تیری عمر ہو۔ اور جرا میرا چرکھا تو کات دے"

...... بھالو خوخو کرکے منھ موڑ لیتا ہے

سب بچے ہنس دیتے ہیں۔

مداری "ارے مان جا ناراج کیوں ہوگئی میرا چرکھا کات لے۔ نہیں کاتتی۔ صاحب اچھا من جا۔ جرا آٹا گوندھ لے۔ مالک کا آٹا گوندھ لے۔

بھالو آٹا گوندھتا ہے۔

(اسی طرح پنکھا جھلنا۔ روٹی پکانا وغیرہ جوڑ سکتے ہیں)

مداری "جرا ناچ تو کرے بابا۔ تاک دھنا دن تاک دھنا"

...... بھالہ کندھے پر ڈنڈا رکھ کر ادھر ادھر قدم رکھتا ہے۔ بچے چلا چلا کر ہنستے ہیں......

مداری۔ (بی سے) "جرا بابا اپنا بندہ تو دینا"

...... بابا ایک بندہ اتار کر دیتی ہے۔ مداری اس کو اپنے کرتے کی جیب میں چھپا لیتا ہے۔ پھر بھالو سے کہتا ہے۔



مداری۔ "اور چور کیسے پکڑے سپاہی۔ چور پکڑ لے بھائی"

بھالو آہستہ آہستہ چکر لگاتا ہے ایک ایک کو غور سے دیکھتا ہے۔ بچے ذرا ڈرتے ہیں۔ پھر بھالو مداری کے پاس آن کر اس کو دیکھتا ہے۔ مداری رسی کا اشارا کرتا ہے۔ اور بھالو خوخو کرکے اس پر دوڑتا ہے۔ مداری جھوٹ موٹ ڈرتا ہے۔

مداری۔ ارے سرکار۔ ارے حجور، مار ڈالا
لیو صاحب، لیو حجور، اپنی چیج لو۔
.... بندہ نکال کر سب کو دکھاتا ہے

سب بچے ہنستے ہیں۔ مداری بندہ ماما کو دیتا ہے۔ وہ چپکے سے سب کی آنکھ بچا کر اپنے پلّو میں باندھ لیتی ہے۔

مداری۔ چا سلام کر، بابا بڑی سرکار سے
کچھ کپڑا کچھ جوڑا لا، پانچ روپے لا

بھالو ماتھا ٹیک کر سلام کرتا ہے ماں رومال کے کونے سے پیسے کھول کر دیتی ہے۔

مداری۔ "ارے حجور یہ تو کچھ بھی نہ ملا۔ بڑا آسرا لگائے تھے"۔

ماں۔ اور کیا لے گا؟ لے دو آنے اور لے لے

مداری سلام کرکے جھولا اُٹھا کر ڈگڈگی بجاتا ہوا چلا جاتا ہے

پہلا بچہ۔ "کیسے مزے کا بھالو تھا!

دوسرا بچہ۔ "ہاں بھائی جان اور چرخہ کیسے کاتتا تھا"

.... ہاتھ نہ پاتا ہے۔ منی اوں اوں کرکے رونے لگتی ہے۔ سب اس کی طرف دیکھتے ہیں

ماں۔ کیا ہوا منی۔ کیا ڈر گئی؟

منی "ہمالا بندہ"۔

تیسرا بچہ۔ "ارے تمھارا بندہ کہاں گیا؟"

سب بچے:۔ بندہ کیا ہوا؟
"ابھی تو تھا"
"کسی کے پاس ہے"

ماما۔ میں جانوں وہی کمبخت مداری لے گیا۔ ہوگا"۔

پہلا بچہ:۔ اُفوہ! کیسا چالاک آدمی تھا"۔

دوسرا بچہ:۔ "اس کی شکل ہی ایسی ڈراونی تھی ڈاکوؤں کی طرح"۔

تیسرا بچہ "ہاں وہی ہوگا چور"
منی - اوں اوں ہمالا بندہ"
ماں - آؤ ہمارے پاس آؤ - ہم تمھیں اور دیں گے - رومت"
...... ڈگڈگی کی آواز پھر دور سنائی دیتی ہے -

مداری بھالو کو لئے آتا ہے -
ماں - "واہ جی واہ اچھا تماشہ کرنے آئے تھے - میری بچی کا بندہ ہی رکھ لیا - خیر اسی میں ہے - ابھی دے دو"
مداری : - بندہ ! صاحب بندہ تو میں نے دے دیا تھا" (ماما کی طرف اشارہ کرکے)



پہلا بچہ - "بھالو والا ! میں بلاتا ہوں - اس شیطان کو"
دوسرا بچہ - "ہاں اس کو ابھی پکڑ دو"
.... سب بچے دوڑے ہوئے جاتے ہیں - بھالو والے او بھالو والے چلاتے ہیں

ان کو دیا تھا"
ماما "چل جھوٹے مجھے کب دیا تھا ؟ چوری اور سینہ زوری"؟
مداری غصے سے اس کی طرف دیکھتا ہے
مداری اچھا حضور - گھبراؤ نہیں - ہم ڈھونڈیں گے"

...... ڈگڈگی بجاتا ہے اور ڈنڈا بھالو کو دیتا ہے

مداری۔ "چل تو بیٹا۔ ڈھونڈھ دکھا۔ چور کیسے پکڑے سپاہی"

بھالو پہلے کی طرح گھوم گھام کر سب کو دیکھتا ہے۔ جیوں ہی ماما کے پاس آتا ہے مداری رسی کا اشارہ کرتا ہے۔ بھالو خو خو کرکے اس کے پیچھے دوڑتا ہے ماما چیخیں مارتی ماں کے پیچھے چھپنے کی کوشش کرتی ہے۔ سب بچے چیخیں مارتے بھاگتے ہیں۔ ایک گرتا ہے۔

ماما:۔ "اوئی، اوئی میں مری۔ ارے چھوڑ دو
ارے بھائی بھالو والے چھڑا لے۔ میں
دیتی ہوں بندہ میرے ہی پاس ہے
ارے میں مری"

مداری۔ بھالو بٹھا لیتا ہے۔ ماما کرسی کے پیچھے سے بیٹھی بیٹھی ڈرتے ڈرتے ہاتھ بڑھا کر بندہ دیتی ہے۔

پہلا بچہ:۔ "اچھا چور آپ ہی تھیں۔ واہ واہ!"

دوسرا بچہ:۔ "تو اس بے چارے کا نام کیوں لگایا۔؟"

ماں "کیوں ری نامراد یہ تیری حرکت کیا تھی؟"

ماما کرسی کے پیچھے سے ہاتھ جوڑتی ہوئی "بیوی مجھ سے قصور ہوا۔ ہاتھ جوڑتی ہوں"

ماں (مداری کو پیسے دیتے ہوئے) "لو بھالو کو کچھ کھلا دینا"

.... مداری لے کر سلام کرتا ہے

منّی (تالیاں بجا کر) ہمالا بندہ مل گیا، ہمالا بندہ مل گیا۔



جامعہ ــــــــــ میری یاد میں!

عبدالرحمٰن نذیر ازنیر بلوچستان

بڑوں کے مقابلے میں بچوں کو قصے کہانیاں سننے اور پڑھنے کا زیادہ شوق ہوتا ہے۔ کہانی ذرا دلچسپ ہو۔ بس پھر نہ انھیں کھانے پینے کا شوق رہتا ہے نہ کھیل کود کا خیال آتا ہے۔ قصے میں کوئی حیرانی کی بات ہوئی تو اُن کا منہ کھلا کا کھلا رہ جاتا ہے، خوشی کی بات ہوئی تو خوب خوش ہوتے ہیں۔ کہانی ذرا لمبی بھی ہو تب بھی بچے اس کے ختم ہونے تک نہایت فرماں برداری سے بیٹھے رہتے ہیں چاہے گھنٹے لگ جائیں۔ الغرض ایک مزے دار کہانی بچوں کے لئے سب سے بہتر تحفہ ہے

میری چھوٹی بہن سلیمہ کو دیکھو۔ کہانی سننے کے لئے ہر وقت تیار رہتی ہے۔ کالج سے گھر آتا ہوں تو پہلا سوال یہ ہوتا ہے۔ بھائی جان آج کی کہانی! میں یہ کہہ کر کہ وقت تو آنے دو۔ اپنے کام میں مشغول ہو جاتا ہوں۔ شام کے وقت کالج ہاکی کھیلنے جاتا ہوں۔ واپسی پر سلیمہ کی بات یاد آتی ہے۔ دل ہی دل میں کہتا ہوں "ہر روز ایک نئی کہانی سُنا سُنا کر میرا تمام ذخیرہ اب ختم ہو چکا۔ کوئی کتاب بھی نہیں ملی کہ سلیمہ کی دلچسپی کی کہانی یاد کر لیتا" ان ہی خیالات میں غرق میرا سفر جلد طے ہو جاتا ہے کھانے سے فارغ ہوئے، اور باتیں شروع ہو گئیں تھوڑی دیر میں سلیمہ بستر وغیرہ تیار کر میرے گرد ہو جاتی ہے۔ بھائی جان! کہانی ......"

"سلیمہ! سنو! جب تک کوئی کہانی ختم نہ ہو۔ تم وعدہ کرو کہ اس وقت تک نہ سوؤ گی"

"ہاں بھائی جان میں وعدہ کرتی ہوں کہ

کہانی ختم ہونے تک نہ سوؤں گی "۔

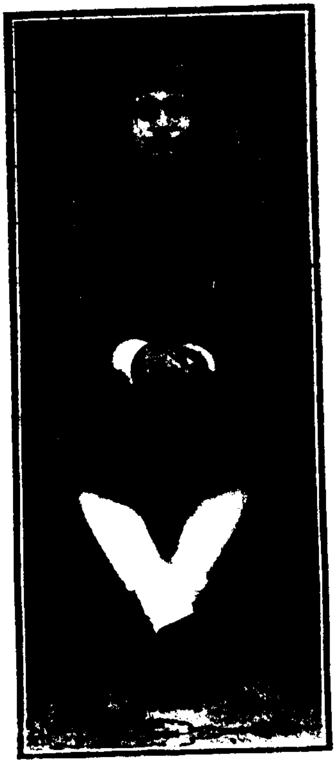
"اچھا تو تیار ہو جاؤ۔ یہ کہانی نہیں۔ سچا قصہ ہے۔ تم "جگ بیتی" روز سنتی رہی ہو، اب آپ بیتی سنو۔

اگست ۱۹۲۳ء میں میں جامعہ میں داخل ہوا۔ جامعہ اس وقت علی گڑھ میں تھی۔ میں کوئی سات آٹھ برس کا ہوں گا۔ اداس تو ضرور ہوا لیکن اُستاد مہربان ملے۔ پھر ہم عمر بھی کئی تھے چند دنوں ہی میں ہم آپس میں گھل مل گئے۔ اور گھر کی یاد آہستہ آہستہ مدھم ہونی شروع ہوئی۔ مجھے اس وقت کا کوئی خاص واقعہ یاد نہیں۔ اتنا ضرور یاد ہے کہ گرمی کے دن تھے اور ہم اپنے دارالاقامہ (بورڈنگ) کے سامنے کے وسیع میدان (جس میں بہت سے سایہ دار درخت تھے) میں چارپائیاں بچھا کر سوتے تھے چھوٹے ہم ضرور تھے۔ لیکن شرارتیں بہت کرتے تھے۔ سلیمہ اسن رہی ہونا۔ درخت کے پھلوں کو توڑنے کے لئے۔ تین چار ہم جماعت چپکے سے اپنی چارپائیوں سے اٹھتے اور اینٹیں مارتے۔ پھل تو ذرا بھی نہ گرتے۔ مگر وہ اینٹ یا کنکر کسی بے چارے سونے والے کے ضرور لگ جاتا۔ وہ نگراں کے پاس شکایت لے جاتا۔ اور اس عرصے میں ہم اپنے اپنے بستروں پر خراٹے بھرتے ہوتے۔ مار نہ کھائی پھر بھی اُستاد خفا ضرور ہوتا تھا۔ ایک بات اور یاد ہے ان ہی گرمیوں میں بڑے لڑکے اپنی چارپائی ایک دوسرے کی چارپائی پر بچھاتے تھے۔ چار دوست آپس میں مل کر یہ کام انجام دیتے تھے۔ ہم نے بھی اسی طرح کیا۔ پہلے تو چارپائی گر پڑی، لیکن بعد میں اس طرح سے بچھائی گئی کہ پھر کبھی نہ گری۔

شام کو بڑے لڑکے فٹ بال کھیلتے تھے اور ہم دیکھتے تھے۔ ایک واقعہ مجھے اب تک یاد ہے یہ اُستادوں اور طالب علموں کا "گلی ڈنڈا" کا میچ تھا۔ خوب کھیل ہوا۔ دونوں برابر رہے اور ہم تالیاں بجا بجا کر اپنے جی کو خوش کر رہے تھے۔

"بزم کمال[1]" اپنے جلسے باقاعدہ منعقد کرتی رہی۔ اس کے صدر جناب حافظ فیاض احمد صاحب انصاری تھے۔ ہم بھی شامل ہوتے اور اپنی نئی

[1] جامعہ کے اسکول کے بچوں کی انجمن



ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری مرحوم (سابق امیر جامعہ)

جامعہ کے دوسرے شعبوں کی طرح مرحوم کو پیام تعلیم سے بھی خاص دلچسپی تھی۔ پچھلے سال کے سالگرہ نمبر میں انھوں نے تمھیں بہت اچھی نصیحت کی تھی۔ آج ہم اس نصیحت کو یہاں دوبارا نقل کرتے ہیں یہ ایک مرنے والے بزرگ کا اپنے بچوں کے نام گویا آخری پیغام ہے۔

"تم اکیلے ہو یا اوروں کے ساتھ اپنے گھر میں ہو یا مدرسے میں، یا کھیل کے میدان میں، ہر جگہ اور ہمیشہ وہ کرو جو سچ مچ تمھارا من چاہتا ہے اپنی اصلی دلی خواہشوں کو دباؤ مت۔ دوسروں سے ڈر کر یا دوسروں کو خوش کرنے کی خاطر دوسروں کی خواہ مخواہ نقالی نہ کرو خود اپنی اپج سے کام کرو۔ ایسا کروگے تو تمھارا ذہن، تمھاری سیرت، تمھارا جسم، سب کے سب وہ اچھی شکل اختیار کریں گے۔ جن کے حاصل کرنے کی صلاحیت و قدرت، خدا نے ان میں رکھی ہے۔"



پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی، ایم۔اے
صدر شعبہ اردو۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ



حضرت جوش۔ ملیح آبادی
ایڈیٹر رسالہ کلیم دہلی۔

عقل کے مطابق ہر تقریر کرنے والے کو جانچتے ۔ "بزم" کا سالانہ جلسہ آیا ، اور انعامی تقریروں کا سلسلہ شروع ہوا ۔ میں نے بھی اس میں حصّہ لیا ۔ پہلی کوشش تھی ۔ انعام ایک بہتر تقریر کرنے والے کو ملا ۔ اس کے بعد جامعہ ، دہلی آگئی اور اُس کے ساتھ میں بھی دہلی آگیا ۔ سُن رہی ہو نا سلیمہ !

"جی ہاں"

نئی عمارتوں میں ہماری جماعتیں تھیں ۔ کچھ اُستاد نئے ۔ درجہ بھی نیا ۔ ایک نئے دل کے ساتھ ہم نے پڑھائی شروع کردی ۔ ہمارا دارالاقامہ وہ لمبی عمارت تھی جو شاید اب بھی جامعہ کے بالکل سامنے ہے ۔ تمام لڑکے اسی میں رہتے تھے ۔ جب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب ایم اے ، پی ایچ ، ڈی جامعہ کے پرنسپل بنے تو جامعہ کی زندگی کا نیا دور شروع ہوا ۔ دو اور نہایت ہی قابل اور شفیق و مہربان اُستاد وہ اپنے ہمراہ لائے ۔ یہ جناب ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ۔ ایم اے ، پی ایچ ڈی اور جناب محمد مجیب صاحب بی اے (آکسن) ہیں ۔ پرانا دارالاقامہ چھوڑ دیا گیا ۔ اور طلبا ر عمر کے لحاظ سے مختلف نگرانوں کے زیر نگرانی نئے دارالاقاموں میں جا بسے ۔ میں اور میرے ساتھی "پیلی کوٹھی" میں رہنے لگے ۔ ہمارے نگراں جناب ارشاد الحق صاحب تھے ۔ یہ بہت ہی اچھے اور مہربان اُستاد تھے ۔ ہماری ہر طرح مدد کرتے تھے ۔ ہم آپس میں بھائی بھائی تھے اور یہ ہمارے سرپرست کیلاٹ صاحب کھیلوں کے نگراں تھے ۔ وہ ہمیں باقاعدہ ورزش اور ڈرل بھی کراتے تھے ۔ جامعہ کا کھیلنے کا میدان بہت بڑا تھا لیکن اس میں صرف بڑے لڑکے ہی کھیل سکتے تھے ، ان کو کھیلتے دیکھ کر ہمیں بھی شوق پیدا ہوا ۔ اگرچہ یہ شوق پہلے بھی کئی دفعہ پیدا ہو چکا تھا مگر اب ہم اپنے شوق کو عملی جامہ پہنانا چاہتے تھے ۔ تمام لڑکوں کو جمع کیا گیا ، صلاح کی گئی اور بغیر کسی حیل و حجت کے یہ قرار پایا کہ کل سے باقاعدہ کھیل شروع ہو ۔ دوسرا دن آیا اور ہم نہایت جوش و خروش سے آپس میں اپنی اپنی "ٹیم" کے متعلق اظہار خیال کر رہے تھے ۔ وقت سے بہت پہلے ہم پہنچ گئے ۔ ایک دو کے پاس نئی

ہشکیں تھیں۔ چند ایک کے پاس پرانی، اور کچھ "ڈنڈے" لے آئے تھے۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ دو لڑکے ایسے تھے جن کے پاس مڑی ہوئی لکڑی تھی۔ وہ اسی سے خوش تھے۔ میری ٹیم مکمل تھی دوسرا گروہ آیا اور کھیل فوراً شروع کر دیا گیا۔ ایک پرانی دھرانی گیند سے جو بڑے لڑکوں نے بے کار سمجھ کر پھینک دی تھی ہم کھیل رہے تھے۔ جدھر گیند ہوتا اُدھر ہی ہم سب۔ بعض گیند کو مارتے مگر لگتی کسی کے گھٹنے پہ یا پیر پر۔ اور وہ وہیں پیر پکڑ کر بیٹھ جاتا۔ دوسروں کو کھیل میں مشغول دیکھتا تو زخم کو مَل مَلا کر پھر شامل ہو جاتا۔ گیند بچاری کی بُری طرح سے خبر لی گئی وہ اس صدمے کو نہ سہہ سکی اور پھٹ گئی۔ مگر ہمارا کھیل جاری رہا۔ یہاں تک کہ اندھیرا ہو گیا۔ اور گیند بھی کھیلنے کے قابل نہ رہی۔ مجھے سلیمہ اس بات پر فخر ہے کہ میں نے پہلے پہل ہاکی جامعہ میں سیکھی۔

سلیمہ میرے ہم جماعتوں میں ایک تو اشفاق حسین صاحب تھے۔ یہ صاحب مجھے اس لئے یاد ہیں کہ یہ ہماری جماعت میں کافی ہوشیار تھے محنت خوب کرتے تھے اور خوش خطی میں اول نمبر رہتے تھے۔ اسی زمانے میں اُن کا خط اتنا اچھا ہو گیا کہ خوش نویس معلوم ہوتے تھے، دوسرے صاحب جو مجھے یاد ہیں وہ محمد سعید صاحب ہیں۔ یہ ڈرائنگ میں بہت اچھے تھے۔ ہمارے ڈرائنگ ماسٹر جناب اختر حسن صاحب فاروقی تھے۔ انھوں نے آتے ہی نہایت کوشش سے ہر لڑکے کو ڈرائنگ سکھانا شروع کی لیکن میرا دل ڈرائنگ میں نہ لگا۔ وجہ اب تک سمجھ میں نہیں آتی حالانکہ یہ جانتا ہوں کہ یہ بہت ہی ضروری مضمون ہے۔ سالانہ امتحان ہوا اور میرے خیال کے مطابق جناب فاروقی صاحب نے پیالہ اور پرچ بنانے کو دیا۔ کون کہتا ہے کہ ڈرائنگ میں نقل نہیں ہو سکتی فاروقی صاحب کو چند منٹ کے لئے دفتر جانا پڑا ادھر سعید نے میری غلط سلط ڈرائنگ مٹا کر جلد جلد ایک معمولی قسم کی ڈرائنگ تیار کر دی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ مجھے سترہ بٹا پچاس نمبر ملے ہیں عربی ہمیں ارشاد الحق صاحب پڑھاتے تھے۔ اور انگریزی جناب ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب

تاریخ اسلام جناب نذیر نیازی صاحب، اور الجبرا و جیومیٹری جناب برکت علی صاحب۔ اور دوسرے اُستاد بھی تھے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں ثانوی اول میں تھا۔ آج سے دس سال پہلے میں اس وقت گیارہ برس کا تھا اور تم سلیمہ شاید گیارہ دن کی بھی نہ ہو گی! جامعہ میں چرم سازی (چمڑے کا کام) کا درجہ بھی کھلا تھا۔ میں نے بھی کچھ سیکھا۔ لیکن بعد میں چھوڑ دیا۔ اسی زمانے میں کھدر کی تحریک نہایت زور شور سے جاری تھی۔ سلیمہ کھدر تو ہم پہنتے تھے۔ مگر اب کھدر اپنے ہاتھ سے تیار کرنے لگے۔ چرخے کاتنا شروع کیا گیا۔ روئی سے تاگا بنایا جانے لگا۔ اور ہم تمام اس میں شامل تھے۔ خود شیخ الجامعہ صاحب اس میں موجود تھے

"سلیمہ وقت زیادہ ہوا جا رہا ہے۔ اور تمھیں نیند آ رہی ہو گی۔ اس لئے.........

"نہیں بھائی صاحب آپ سناتے چلیں میں سن رہی ہوں"

قصہ ابھی کافی لمبا ہے۔ میں اسے نہایت مختصر الفاظ میں ادا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ جامعہ جب دہلی میں آ گئی تو اس کی مالی حالت پہلے سے کچھ اچھی ہو گئی۔ مولانا محمد علی صاحب مرحوم، اکثر جامعہ میں تشریف لاتے تھے۔ بچوں سے باتیں کرتے تھے اور اُن کو خوش دیکھ کر خود بھی خوش ہوتے تھے مسیح الملک جناب حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم جامعہ کے سرپرست تھے۔ وہ جامعہ میں نہایت دلچسپی لیتے تھے۔ ہم بچے تھے۔ لیکن ہم دیکھتے تھے کہ مولانا محمد علی صاحب، مولانا شوکت علی صاحب، ڈاکٹر انصاری صاحب اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب آپس میں بڑی دیر تک جامعہ کے متعلق باتیں کرتے تھے۔ وہ اپنے ہمراہ اور بھی بہت سے معزز اصحاب کو لاتے تھے اور جامعہ کا معائنہ کراتے تھے سب جامعہ سے خوش تھے۔ یوم تاسیس پر نہایت شاندار مشاعرہ ہوتا تھا۔ ملک کے مشہور شعرا بلائے جاتے تھے۔ رات کو پرتکلف دعوت ہوتی تھی۔ جامعہ کے ٹکرے سلیمہ مجھے ابھی تک یاد ہیں تم سے اُس طرح تیار نہ ہو سکے! اسی زمانے میں جناب عبدالغفار صاحب مدہولوی نے اپنے ڈرامے تیار کئے پہلے پہل تو انھوں نے اپنے دارالاقامہ

(جس کے وہ نگران تھے) یہیں یہ ڈرامہ تیار کیا اور وہیں دکھایا۔ بچوں کے شوق اور اُن کی قابلیت سے جناب عبدالغفار صاحب نے پوری طرح فائدہ اُٹھایا جب جامعہ کے ہال میں "بچوں کا انصاف" دکھایا گیا تو سب نے پسند کیا۔ قدرتی ایکٹنگ نے کھیل میں جان ڈال دی تھی۔ وہ تمام نقشہ میرے دماغ میں اسی طرح موجود ہے۔ اور بھی "کھیل" تیار ہوئے اور نہایت پسندیدگی کی نظر سے دیکھے گئے۔ جب سالانہ جلسہ ہوا۔ تورات کی دعوت کے بعد ایک نیا ڈرامہ عبدالغفار صاحب نے پیش کیا۔ چونکہ مجھے بھی ڈرامے سے بہت شوق تھا۔ اس لیے میں بھی وہیں موجود ہوتا۔ جہاں دوسرے اکٹھے ہوتے تھے جناب مدہولوی صاحب نے دیکھا تو مجھے بھی پہلے سین میں شامل کرلیا۔ یہ سین اقبال کا ترانہ تھا۔

"چشتی نے جس زمیں میں پیغامِ حق سنایا"

میں خوش تھا۔ اور جب وقت آیا تو میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ گانا بند بالکل نہ ہو یعنی جب لڑکے ایک مصرعے کے بعد ذرا رُک کر دوسرا مصرعہ شروع کرتے تو میرا خیال تھا کہ اس طرح نہ ہونا چاہئے۔ بلکہ گاتے ہی رہنا چاہیئے۔ میں بالکل نہ تھما۔ بلکہ آدھ ایک سیکنڈ آگے ہی رہا۔ پردے کے پیچھے سے جناب عبدالغفار صاحب ہدایت دے رہے تھے۔ کہ آہستہ آہستہ۔ مگر میری سمجھ میں نہ آیا۔ پر نہ آیا! ڈرامے کا شوق بھی مجھے جامعہ کے طفیل ہوا۔ میں اس کا اعتراف کرتا ہوں سلیمہ تمہاری سہیلیوں کی طرح میرے بھی کئی دوست تھے۔ چند ایک بہت ہی اچھے دوست تھے۔ شبیر حسین جس کو اب آنکھیں اس دنیا میں نہیں ڈھونڈ سکتیں، ہر وقت میرے ساتھ رہتے تھے۔ ہاکی خوب کھیلتے تھے اور چونکہ وہ پنجابی تھے۔ اس لئے محبت اور بھی گہری ہوگئی۔ حافظ مزمل بھی میرے اچھے دوست تھے سلیمہ تم کو معلوم ہے وہ بھی اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ نہایت حسرت ناک طور پر (دریا میں ڈوب کر) وہ جدا ہوئے!! خدائے برتر ان دونوں کی مغفرت کرے۔ اور بھی کئی دوست تھے۔ مگر زمانے نے اُن سب کو بھلا دیا ہے۔

"پیامِ تعلیم اس وقت پندرہ روزہ تھا سلیمہ جس دلچسپی سے اب تم پیامِ تعلیم پڑھتی ہو

شاید اس سے کہیں زیادہ دلچسپی سے میں پڑھا کرتا تھا۔ جامعہ ماہوار شائع ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ بڑے طالب علم ایک قلمی رسالہ جوہر شائع کرتے تھے۔ اس میں جامعہ کے حالات بھی ہوتے تھے۔ اس بات کو اب دس برس گذر گئے ہیں لیکن وہ باتیں اب تک یاد ہیں۔ میری پہلی درس گاہ! اور اب بھی اگر میں وہاں ہوتا تو خدا جانے کیا ہوتا یہ میری بدنصیبی ہے۔ سلیمہ۔ مجھے وہاں ضرور رہنا چاہئے تھا! سلیمہ تمھاری آنکھوں میں نیند آرہی ہے۔ جاؤ سو رہو۔ پھر کسی اور وقت میں تمھیں دوسری باتیں سناؤں گا۔

گھڑی نے ٹن ٹن کرکے دس بجائے، اور میرے بھائی اعجاز نے کہا:۔

چھوڑ دو بھی اب جانے دو
کیوں کرتے ہو، ایسی باتیں
کب آتے ہیں ایسے دن
اور کب آتی ہیں ویسی راتیں



"پرندوں میں زرافہ یعنی گرے ہارن
اس کی گردن کوئی تین فٹ لمبی ہوگی۔

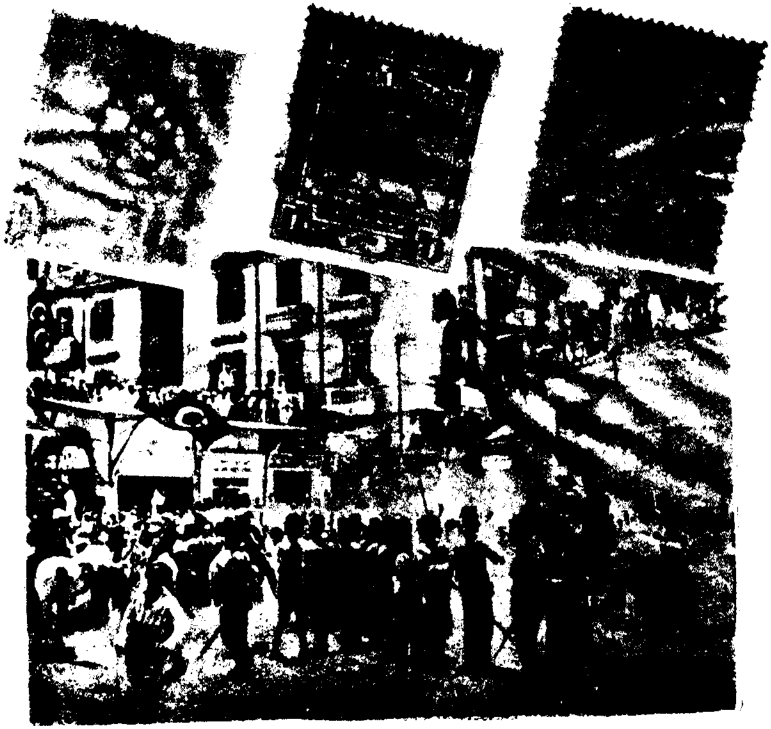
ٹِکٹوں پر لڑائی

مسعود حسین خاں صاحب

لڑنے والوں کو بھلا کون روک سکتا ہے جس بات پر چاہیں لڑ جائیں۔ مگر پھر بھی شاید تمھیں یہ سن کر تعجب ہو کہ کبھی کبھی ٹکٹ جیسی ذرا سی چیز پر بھی لوگ لڑ لڑ گئے ہیں۔ پیام بھائی تو سب سمجھ دار لوگ ہیں۔ امید ہے کہ یہ ٹکٹوں پر کوئی لڑائی مول نہ لیں گے اور اگر کچھ واقعات ایسے بھی سامنے رہیں جب ٹکٹوں پر لڑائیاں ہو ہو گئی ہیں تو شاید اور بھی احتیاط کرو۔ اچھا سنو۔

۱۹۰۸ء کا ذکر ہے کہ سوڈان میں ایک ٹکٹ نکلا، جس پر ایک شتر سوار کی تصویر تھی جو ڈاک لیے جاتا تھا۔ تصویر سب کو بھائی، مگر جگر ڈھونڈنے والے تو کرید کرید کر بات نکالتے ہیں۔ یہ بھی پتہ لگا لیا کہ یہ ٹکٹ جس کاغذ پر چھپا ہے اس پر ایک کنول کے پھول کا "واٹر مارک" ہے جو کچھ کچھ صلیب سے ملتا ہے۔ واٹر مارک تو شاید تم جانتے ہی ہوگے۔ کاغذ بناتے وقت اس میں کچھ ایسے نشان ڈالے جاتے ہیں کہ یوں تو دکھائی نہیں دیتے روشنی کے مقابلے میں رکھ کر دیکھو تو دکھائی دیتے ہیں۔ ٹکٹوں اور نوٹوں کے کاغذ پر اکثر کوئی نہ کوئی واٹر مارک ہوتا ہے کہ ہر ایک آسانی سے کسی معمولی کاغذ پر چھاپ نہ لے۔ ہاں، تو اس سوڈانی ٹکٹ پر صلیب کا سا واٹر مارک تھا۔ اور صلیب عیسائیوں کا مذہبی نشان ہے۔ اس پر مصر اور سوڈان کے لوگ بہت بگڑے اور ڈاک خانوں پر چڑھ دوڑے۔ ہر جگہ بلوں کی سی صورت پیدا ہو گئی تو حکومت نے مجبور ہو کر سب ٹکٹ تلف کر دیے اور نیا ٹکٹ جس کاغذ پر چھاپا اس میں چاند اور تارے کا واٹر مارک رکھا۔ یوں معاملہ رفع دفع ہوا، نہیں تو خون خرابا ہوا ہی چاہتا تھا۔

اب ذرا امریکہ کا نقشہ تو نکالو۔ اس براعظم کے



سوڈان کے ٹکٹ جن کا ذکر اس مضمون میں ہے اور اس کے دونوں
واٹر مارک۔ اس کی وجہ سے قاہرہ میں جو بلوہ ہوا اس کی تصویر
ٹکٹوں کے نیچے ہے۔



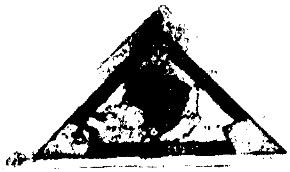
جمہوریہ ڈومنکا کا ٹکٹ
جس پر جھگڑا ہوا تھا۔



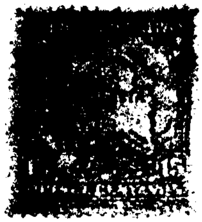
نکاراگوا کا ٹکٹ جس میں
آتش فشاں پہاڑ دکھائے گئے ہیں۔



مسٹر روزویلٹ صدر جمہوریہ امریکہ بھی ٹکٹوں کے بڑے شوقین ہیں۔ یہ ان کے فرصت کے وقت کا بہترین مشغلہ ہے۔ اس تصویر میں ٹکٹوں کا البم ان کے سامنے ہے اور ایک نادر ٹکٹ آتشی شیشے سے دیکھ رہے ہیں۔



ایتھوپیا کا ٹکٹ جو پولینڈ والوں کو کھٹکتا ہے





پیراگوئے اور بولیویا کے ٹکٹ جن سے چھ سال کی جنگ کا سلسلہ چلا۔

دو بڑے بڑے حصّے ہیں، شمالی اور جنوبی۔ جہاں یہ حصے ملے ہیں وہاں دیکھو، مشرق کی طرف سمندر میں، جنوبی امریکہ کے اوپر شمال میں بہت سے جزیرے ہیں۔ ان ہی میں ایک جزیرہ ہے جس میں لکھا ہوگا سینٹو ڈومنگو اور ہائیٹی۔ جزیرہ ایک ہی ہے، مگر یہ دونوں الگ الگ جمہوریتیں ہیں

۱۹۰۰ء میں سنتو دومنگو کی حکومت نے ایک ٹکٹ جاری کیا جس میں پورے جزیرہ کا نقشہ تھا اور اس میں اپنی اور ہائیٹی کی سرحد کا نشان بھی دیا تھا۔ مگر یہ نشان بنا تھا ہائیٹی کے علاقہ میں بہت اندر کو ہٹا کر۔ یوں تو ہائیٹی ہے جزیرے کا کوئی آدھا، مگر اس ٹکٹ میں بس ذرا سا دُم چھلا معلوم ہوتا تھا۔ اس ٹکٹ کا نکلنا تھا کہ ہائیٹی کی ننھی سی جمہوریت میں آگ ہی تو لگ گئی۔ فوجیں جمع کی جانے لگیں سرحد پر کسی جگہ بے ضابطہ جھڑپ بھی ہوگئی، اور بس سارا رنگ، جنگ کا سا پیدا ہوگیا۔ آخر کو ٹکٹ کی مہر بنانے والے نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور حکومت نے ٹکٹ کا چلن روکا، تب جاکر امن ہوا۔

اس کے قریب کا ایک اور حال سنو۔ امریکہ کے دونوں بڑے بڑے حصوں کو جو تپلی سی زمین کی پٹی ملاتی ہے اس سے امریکہ کے جہازوں کو بڑی دقت ہوتی تھی۔ مشرق سے مغرب جانا ہو تو سارے براعظم کا چکر کاٹو۔ اس لئے کوئی ساٹھ برس ہوئے امریکہ والوں نے اس کی ٹھانی کہ اس تپلی سی پٹی میں سے ایک نہر نکالیں تاکہ جہازوں کو ادھر سے اُدھر جانے میں آسانی ہو جائے۔ اب اس نہر کا نام نہر پناما ہے۔ بھلا تم یقین کروگے کہ اس نہر کی قسمت کا فیصلہ بھی ایک ٹکٹ ہی نے کرایا؟ قصہ یہ ہوا کہ جب نہر بنانے کا فیصلہ ہوچکا تو طے یہ کرنا تھا کہ ٹھیک کس جگہ سے نہر نکالی جائے۔ اس تپلی سی پٹی میں کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں ہیں۔ ان میں ایک کا نام ہے نکاراگوا اور ایک کا پناما۔ ایک خیال یہ تھا کہ نہر نکاراگوا کے علاقہ میں سے نکلے، ایک یہ کہ پناما میں سے جائے۔ دونوں علاقوں کے لوگ اس کوشش میں تھے کہ نہر ہمارے یہاں سے نکلے۔ یہ کام بہت بڑا تھا اور خیال تھا کہ جس علاقہ میں ہوگا وہ مالا مال ہو جائے گا۔ فیصلہ پہلے نکاراگوا کے حق میں ہونے کو تھا کہ ایک دن صبح امریکن کانگریس کے ہر ممبر کے پاس ایک گمنام خط پہنچا جس کے لفافہ پر نکاراگوا کا سب سے نیا ٹکٹ چپکا ہوا تھا۔ اس ٹکٹ پر کئی آتش فشاں پہاڑ بنے تھے کہ یہ اس علاقہ کی خاص چیز ہیں! خط میں اس بات پر زور تھا کہ اس علاقہ میں سے نہر نکلی تو کیا عجب ہے کہ آتش فشاں پہاڑ اسے تباہ کر ڈالیں۔ بس کیا تھا، یکایک ہوا پلٹی، اور تصفیہ

یہی ہوا کہ نہر پناما کے علاقہ میں سے نکالی جائے۔

اب ذرا یورپ کا نقشہ کھولو۔ اس میں مشرق کی طرف بڑا سا ملک ہے، روس۔ اس کے شمال ومغرب کے کونے میں ایک چھوٹی سی ریاست ہے لتھونیا۔ یہ علاقہ پہلے روس کا تھا، مگر بڑی جنگ کے بعد اس طرف کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں الگ بن گئیں۔ ان ہی میں ایک لتھونیا بھی ہے۔ ۱۹۲۰ء میں پولینڈ نے ان کا خاص شہر ولنا اور اس کے قریب کا علاقہ دبا لیا۔ ابھی تک یہ شہر اور اس کے آس پاس کا علاقہ پولینڈ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ مگر لتھونیا والے اسے بھولے نہیں ہیں۔ اور ابھی ایک ٹکٹ نے تو تعلقات بہت ہی کشیدہ کر دیے ہیں۔ یہ ٹکٹ ہوائی ڈاک کے لئے ۱۹۳۲ء میں چھپا ہے۔ اس کے بیچ میں لتھونیا کا ایک نقشہ ہے۔ ولنا والے علاقہ کو بھی اس نقشہ میں دکھایا ہے، اگرچہ رنگ ذرا بدل کر۔ آس پاس جو پڑوسی ہیں سب کا نشان دیا ہے لیٹ لینڈ ہے، جرمنی ہے، روس ہے، مگر نہیں ہے تو پولینڈ نہیں ہے! گویا کہ پولینڈ کا ہونا ہی تسلیم نہیں! اس ٹکٹ سے پولینڈ والے بہت جلتے ہیں اور جب سے چھپا ہے دونوں ملکوں میں اور بھی ٹھن سی گئی ہے۔ اگر کبھی یہ دونوں ریاستیں لڑیں جس کا بہت کچھ امکان ہے تو جنگ کے اسباب میں یہ ننھا سا ٹکٹ بھی ہوگا۔

اچھا اب ذرا جنوبی امریکہ کا نقشہ کھولو۔ اس میں دو ریاستیں نکالو، بولیویا اور پاراگوے۔ ان دونوں میں سنہ ۱۹۲۰ء سے جنگ تھی اور کوئی چھ برس رہی۔ ابھی پچھلے سال معاملہ چکا ہے۔ بات کیا تھی؟ بات یہ تھی کہ ان دونوں کی سرحد سے ملا ہوا ایک علاقہ ہے "گران چاکو" یا "ہری دوزخ" کہتے ہیں۔ اس کا جنوب مغرب والا حصہ تو ارجن ٹائن کا ہے، شمالی حصہ سنہ ۱۸۹۵ء میں پاراگوے اور بولیویا میں آدھا آدھا بٹ گیا تھا۔ پچھلے دنوں دونوں نے اس پر اپنا اپنا قبضہ جمانا چاہا۔ اور چھیڑ پاراگوے کی حکومت کی طرف سے یوں ہوئی کہ سنہ ۱۹۲۷ء میں اس نے ایک ٹکٹ چھاپا جس پر پاراگوے کا نقشہ تھا اور اس میں چاکو کے سارے علاقہ کو اپنی مملکت جتایا تھا۔ بس کیا تھا۔ بولیویا والے آپے سے باہر ہوگئے۔ چند ہی دن بعد بولیویا نے بھی ایک ٹکٹ چھاپا اور اس میں اپنا نقشہ دیا اور سارے چاکو کے علاقہ کو اپنی حد میں کر کے دکھایا۔ یوں پہلے تو ٹکٹوں ہی پر یہ جھگڑا ہوتا رہا، مگر ہوتے ہوتے میدان جانے کی نوبت آگئی اور کوئی چھ سال تک یہ جنگ چلتی رہی۔ اور یہ سب کچھ بس ان ذرا سے ڈاک کے ٹکٹوں پر۔

ہمارے دیس کے پرند

بئے کی جھونجھ

از جناب سالم علی صاحب دہرہ دون



یہ اچھا اور دلچسپ مضمون ہماری درخواست پر جناب سالم علی صاحب نے مرحمت فرمایا ہے، آپ کو پرندوں کی زندگی کی تحقیق کا خاص شوق ہے اور اس سلسلے میں آپ بہت کچھ کام بھی کر چکے ہیں۔ یہ مضمون آپ کی محنت اور تحقیق کا بہت اچھا نمونہ ہے یہ مضمون سے متعلق تصویریں بھی سالم علی صاحب نے مرحمت فرمائی ہیں۔ ان میں سے چند کے بلاک چھپ رہے ہیں۔

اصل مضمون انگریزی میں تھا۔ ترجمے پر نظر ثانی جناب صاحبزادہ سعید الظفر صاحب (ایم۔ ڈی) نے فرمائی ہے۔ ہم دونوں بزرگوں کی توجہ اور نوازش کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں

ایڈیٹر

ہمارے ملک کی گھٹی میں یہ زہر ملا ہوا ہے کہ ہر چیز جاندار یا بے جان کی قیمت اس طرح لگائی جاتی ہے کہ گویا خرید وفروخت کا مال ہے اور روپے آنے پائی سے مول تول ہو سکتا ہے۔ مثلاً تعلیم ہی کو لو۔ اس کا اندازہ اس طرح کیا جاتا ہے کہ جب تک تعلیم (جس کا آخری معیار عام خیال میں یونی ورسٹی کی ڈگری ہے) کلرکی تحصیلداری یا خوش قسمتی سے ڈپٹی کلکٹری کے حاصل کرنے میں مدد نہ دے لاحاصل سمجھی جاتی ہے۔ جب خدا کے فضل سے ایک شخص اپنی کچی گندی اور اندھیری کوٹھری کے سامنے آٹا دال باندھ سوتلی، کاٹ کباڑ رکھ کر پیٹ پال سکتا ہے۔ چاہے وہ الف۔ بے بھی نہ جانتا ہو تو اس کا لڑکا اور اس کے بعد اس کا پوتا کوئی دوسرا (یعنی پڑھنے لکھنے کا) راستہ کیوں اختیار کرے۔

جب ایک طرف تو لازمی ابتدائی تعلیم کا معقول انتظام نہ ہو اور دوسری طرف خود ہمارے خیالات اسقدر پست ہوں تو قدرت کے عجائبات سے واقفیت

حاصل کرنے کا خیال (جو یورپ کے ملکوں میں ابتدائی تعلیم کا ضروری جزو سمجھا جاتا ہے) ہمارے اسکولوں اور گھروں میں اسقدر مفقود ہے تو تعجب کی کیا بات ہے ظاہر ہے کہ نباتات یا جانوروں کے متعلق معلومات حاصل کرنے سے آمدنی کی بہت کم امید ہوسکتی ہے تو پھر ان کی تحقیق اور چھان بین میں کیوں پسینہ بہایا جائے۔ کیوں وقت کھویا جائے۔ جانور جو کچھ کرتے ہیں ان کا فعل ہے ہمیں اس سے کیا بحث کہ وہ کیا کرتے ہیں اور کس طرح کرتے ہیں۔

پھر بھی اس جہالت اور پست ذہنیت کی تاریکی میں کچھ کچھ کرنیں پھوٹ رہی ہیں۔ سمجھ دار لوگوں میں اس کی ضرورت کا احساس پیدا ہو رہا ہے۔ قدرتی زندگی کی تحقیقات کی طرف ہمارے ماہرین تعلیم کی توجہ بھی ہوتی جاتی ہے اور اسے اسکولوں میں جاری کرنے کی کوشش بھی تھوڑی بہت ہوئی ہے۔

یہ بالکل یقینی بات ہے کہ بچے کی طاقت بڑھانے "یا کیا اور کیوں" کی سوتی ہوئی قوت کو جگانے اور تحقیق و جستجو کا شوق جاری رکھنے کے لئے کوئی تعلیم مطالعہ قدرت کی برابری نہیں کرسکتی

ہر مبتدی یعنی شروع کرنے والے کے سامنے قدم قدم پر نئے سوال آتے ہیں۔ ان کے حل کرنے کا راستہ بغیر کسی استاد یا کتاب کی مدد کے رفتہ رفتہ اپنے ذاتی مشاہدے سے وہ خود ہی معلوم کرسکتا ہے۔

پرندوں کی زندگی کی تحقیقات ہمارے ملک میں مطالعہ قدرت کی سب سے دلچسپ تحقیقاتوں میں سے ہے۔ ہندوستان کے پرندوں کی افراط اور قسموں کا مقابلہ بہت کم ملک کر سکتے ہیں۔ ہمارے ملک کے اُور چھور میں ہر قسم کا موسم، سماں اور فضا موجود ہے، ایک طرف ہمالیہ کی برفانی چوٹیاں ہیں، اور دوسری طرف ریگستان کے لق و دق میدان یا آسام، کناڈا اور ٹراونکور کے سینکڑوں برس کے پرانے گنجان اور مرطوب جنگل ہیں اس لئے ہر قسم کے پرند ملک کے کسی نہ کسی خطے کو اپنی مرضی کے مطابق پا سکتے اور اُسے اپنا گھر بنا سکتے ہیں۔

ہندوستانی پرندوں کی تحقیقات کا ابتدائی شکل کا کام بہت کچھ اور عمدہ طریقے پر ہو چکا ہے۔ اور شرم کے ساتھ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ سارا کا سارا یورپ کے لوگوں نے اپنے عارضی قیام کے زمانے میں کیا ہے۔ اور اب بہت سی اچھی اچھی مستند کتابیں مبتدی کی مدد کے لئے موجود ہیں



نر کام کر رہا ہے



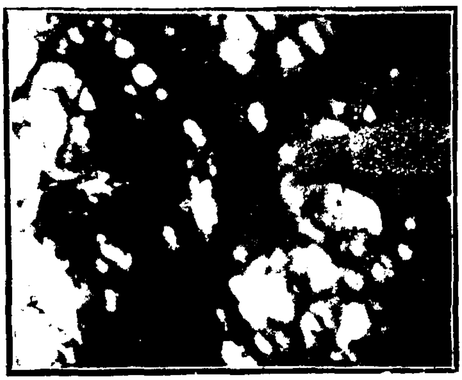
[illegible]

بیر والے درخت کی جو آبادی کے قریب ہیں [illegible]
ایک بیا گھونسلے پر بیٹھا ہے۔



[illegible]

[illegible]



[illegible]

بیا کی مادہ تیزی سے گھونسلے کے دروازے
میں داخل ہو رہی ہے۔



منشی پریم چند آں جہانی - ۸ اکتوبر
کو آپ کا بنارس میں انتقال ہو گیا
اس پرچے میں آپ پر ایک
مضمون بھی ہے -

ایک بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ ہماری زبان میں اب تک کوئی مستند تصویروں والی کتاب نہیں ہے۔ ایسی کتاب جس کی قیمت اوسط درجہ کے لوگوں پر بار نہ ہو، ایسی کتابوں کی کمی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ رنگین تصویروں کی چھپائی بہت مہنگی ہے۔ ایک چینی مقولہ ہے کہ ایک تصویر دس ہزار لفظوں کے برابر ہے۔ پرندوں کے متعلق کوئی کتاب بغیر تصویروں کے بالکل ایسی ہی ہے جیسے ریگستان میں کھاری کنواں۔ اس وقت پرندوں پر سب سے اچھی کتاب

Whistler's
Popular Handbook
of Indian Birds.

ہے۔ یہ مبتدی یا عالم، ہر شخص کے لئے مفید ہے۔ اس میں بہت سی تصویریں ہیں اور کئی ایک رنگین ہیں۔ بمبئی کی نیچرل ہسٹری سوسائٹی

Natural History Society.

کا خیال ہے کہ بہت جلد ایسی ہی ایک کتاب شایع کرے جس سے یہ کمی بہت کچھ پوری ہو جائے گی۔ اس میں کوئی ۱۸۰ تصویریں اور ان پرندوں کا ذکر ہوگا، جو ہندوستان کے مختلف حصوں میں دیکھنے میں آتے ہیں اگرچہ ہندوستان کے مختلف پرندوں پر بہت کچھ مواد جمع ہو چکا ہے پھر بھی الگ الگ ایک ایک پرندے کی زندگی کی تحقیقات میں ابھی تک بہت کچھ گنجائش ہے یہ ایسا کام ہے جس میں ہم سب کچھ نہ کچھ ہاتھ بٹا سکتے ہیں بس ذرا تحقیقات کا شوق اور اس سے بھی زیادہ ہمت



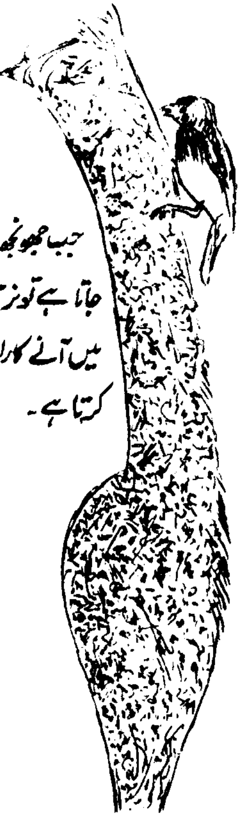
گھونسلا تیزی سے بنایا جا رہا ہے

اور استقلال کی ضرورت ہے۔ وقت کا سوال بھی اہم ہے۔ مثال کے طور پر ہم نیچے بئے کا حال لکھتے ہیں۔ اس کے پڑھنے سے اندازہ ہوگا کہ ہر شخص جس میں شوق ہمت اور استقلال ہو اس کام میں کسقدر اور کس طرح مدد دے سکتا ہے۔

اونچے اونچے پہاڑوں کو چھوڑ کر ہندوستان میں ہر جگہ لوگ بیا اور اس کی عجیب حقہ نما جھونجھ کو پہچانتے ہیں۔ یہ گھونسلے ایک ہی جگہ دس سے لے کر پچاس تک عموماً دیہاتی علاقہ کے درختوں کی شاخوں سے

بسا اوقات تالاب چشموں یا کچے کنوؤں کے قریب لٹکتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔

یہ چڑیا چھوٹی اور ہماری گھریلو گرگریا یا گوریا سے مشابہ ہوتی ہے مگر یہ مشابہت سال میں نو مہینے کے لئے ہے اور اس کو کام کاج کی زندگی کا میلا کچیلا لباس سمجھنا چاہئے۔ برسات کا موسم شروع ہونے اور گھر بنانے سے پہلے اس کی ہیئت اسقدر بدل جاتی ہے کہ پہچان مشکل ہے۔ سر پر زعفرانی کلاہ۔ پُشت اور سینہ کی زعفرانی صدری کی چمک گالوں اور گلے کے لاکھی رنگ سے جس کا ٹیکہ آنکھ تک جا ملتا ہے اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے اور اب اس چڑیا کی شان ایک بانکے رنگیلے چھیلا کی سی ہوتی ہے۔ البتہ مادہ کا لباس جیسا کنوارپن میں ہوتا ہے ویسا ہی ہمیشہ رہتا ہے۔



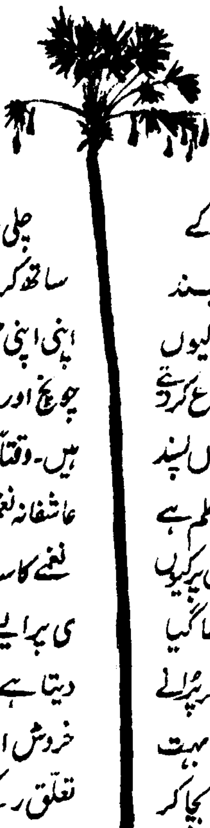
حبیب جھوبجھ پور ابن جاتا ہے تو نر جھوبجھ میں آنے کا راستہ لمبا کرتا ہے۔

میں ایک مرتبہ ایسی جگہ ٹھہرا جس کے قریب بیّوں نے کئی جگہ گھونسلے بنانا شروع کر دیئے تھے۔ میں نے ارادہ کیا کہ ان بیّوں کی حرکات وسکنات کا مشاہدہ اور ان باتوں کا فیصلہ کروں جن کے متعلق مجھے شک تھا میں نے سیڑھی کی طرح کا ایک مچان تیار کرایا جو تقریباً دس فٹ اونچا تھا۔ اس پر بیٹھ کر تاڑ کے پتّوں اور شاخوں کو چاروں طرف لگا کر چھپ سکتا تھا۔ اس طرح ان جانوروں کو بغیر بھڑکائے دیکھ سکتا اور تصویریں لے سکتا تھا۔ اس سیڑھی نما مچان کو تالاب میں ان بیّوں کے قریب گاڑ دیا گیا۔ جہاں میری پہچانی ہوئی نئی آبادیاں تھیں اور جہاں ان کے گھونسلے مچان سے صرف پندرہ فٹ پر بنائے جا رہے تھے تین مہینے تک میں یہاں دو تین گھنٹے برابر چھپا رہتا تھا اور جو کچھ ہوتا تھا اُسے نوٹ کرتا جاتا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ دو تین اور نئی آبادیاں مختلف مقامات پر میری نظر میں تھیں اور ان کی حرکات کا مقابلہ اس مقررہ نئی آبادی سے کرتا رہتا تھا۔ اس طرح جب انڈے بچّوں کا زمانہ ختم ہوا تو تقریباً ستر گھنٹے پہرے پر رہکر ہر حرکت کو جھانک جھانک کر دیکھ کر عکسی تصویریں اور دستی نقش کھینچ کر یقین کے ساتھ اس نتیجہ پر پہنچا کہ جو تفصیلی حالات اس پرندے کے متعلق کتابوں میں درج ہیں صحیح نہیں ہیں۔ ساتھ ہی ایسی باتیں بھی معلوم ہوئیں جن کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔

اس تنکے بننے والے کے کرتوت جو گھر گرستی کے سامان مہیا کرنے یا بیوی بچّوں کے رکھ رکھاؤ کے متعلق پُرانے لکھنے والوں نے اپنی کتابوں میں جمع کئے تھے اور بعد کو ایک کتاب سے دوسری کتاب میں کنبہ نقل ہوتے چلے آتے تھے خیالی پلاؤ ثابت ہوئے میرے ذاتی تجربے اور مشاہدے جو میں نے کئی سال متواتر کئے ان کے مطابق نہیں پائے گئے۔

ان معلومات کا مشاہدہ بار بار کیا گیا ہے اور اِن میں ردوبدل کی ضرورت آج تک پیش نہ آئی۔

وقت اور جگہ کی کمی کے سبب یہ حالات تفصیل سے تو بیان نہیں ہو سکتے ہاں مختصر طور پر سُن لو برسات شروع ہوتے ہی جب گھاس یا دھان کے کھیت دس بارہ انچ بڑھ جاتے ہیں تو نر بئے ایک گروہ میں اپنے چمکتے ہوئے شادی کے جامے میں کوئی درخت معمولاً ببول۔ بیری یا تاڑ پسند کرتے ہیں اور بڑی شاخوں کے سروں یا ان چھوٹی ڈالیوں پر جہاں سے کونپلیں پھُوٹتی ہیں گھونسلے بنانا شروع کر دیتے ہیں۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کسی خاص درخت کو کیوں پسند کیا جاتا ہے اور باوجودیکہ بئے کو غنیم جانوروں کا علم ہے پھر بھی معلوم نہیں کہ یہ گھونسلے زیادہ تر ایسی شاخوں پر کیوں بنائے جاتے ہیں جو پانی پر لٹکتی رہتی ہیں۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ ایک ہی جگہ کئی سال گھونسلے بناتے ہیں۔ مگر پُرانے گھونسلوں کی مرمت کے بعد دوبارہ ان کا استعمال بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔ یہ گھونسلے تیز ہوا کے رُخ کو بچا کر بنائے جاتے ہیں۔ گھونسلوں کے لئے جگہ پسند کرنے کے بعد نر بیوں کے جھُنڈ اُڑ کر کسی قریب کے دھان کے کھیت میں بار بار پہنچتے اور وہاں سے گھونسلا بنانے کا سامان لاتے ہیں۔ ہر نر دھان کی علیحدہ علیحدہ بالی پر پھُنگی سے تقریباً ۱۸ انچ نیچے بیٹھتا ہے اور چونچ سے اس کی پتی میں اتنا گہرا کھانچا دیتا ہے جتنی موٹی دھجی کی ضرورت ہو۔ اس کے بعد گردن کے جھٹکے سے کھینچ کر اس دھجی کو تھوڑی دور تک بڑھاتا ہے پھر اسی طرح دوسرا اور تیسرا



کھانچا پہلے کھانچے کے نیچے دے کر دھجیاں تھوڑی اور لانبی کھینچ لیتا ہے۔ اب آخری دھجی کے کھانچے کو چونچ میں دبا کر اپنے اور ساتھیوں کے ساتھ نئی آبادی کی طرف آتا ہے۔ اُڑنے سے سب دھجیاں بالی سے کھنچ کر علیحدہ ہوکر پرندے کے ساتھ پھُنچلے کی طرح اُڑتی چلی جاتی ہیں۔ یہ پرند ملنسار ہیں۔ کام اور تفریح دونو ساتھ کرتے ہیں۔ جتنے پرند دھجیاں کھینچ لائے ہیں وہ اب اپنی اپنی جھونجھ بنانے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ ان کی چونچ اور پنجے گوندھنے میں خوب پھُرتی اور کارنگیری دکھاتے ہیں۔ وقتاً فوقتاً ایک نر باز و پھٹ پھٹا کر چٹ چٹ چٹ کا عاشقانہ نغمہ شروع کر دیتا ہے۔ فوراً ہی اور سب بھی اس نغمے کا ساتھ شد و مد سے دیتے ہیں اور یہ چی۔ ی۔ ی۔ ی پر ایسے زور کے ساتھ ختم ہوتا ہے کہ دور تک سنائی دیتا ہے۔ جہاں پر نئی آبادی قایم ہوگئی ہو وہاں جوش و خروش اور خوشی کے چہچہے بس دیکھنے اور سننے سے تعلق رکھتے ہیں تم کبھی دیکھو تو کبھی دل سے نہ بھُلاؤ۔

جب گھونسلا بننا شروع ہوتا ہے تو مادینوں کا کہیں پتہ نہیں ملتا۔ مگر جیسے ہی آدھی کے قریب تیاری ہو چکتی ہے دلچسپ واقعات دیکھنے میں آتے ہیں۔ اچانک صبح سویرے ایک مادہ آ دھمکتی ہے۔ کبھی کبھی مادینوں کا ایک جمگھٹ آ جاتا ہے۔ اب تک بے غرض علیحدہ علیحدہ پھرتی تھیں مگر اب انڈوں کی خواہش نے بیتاب کر دیا اور مناسب جگہ ڈھونڈنے اسطرف آ پہنچیں۔ اِن کے نازل ہوتے ہی نروں میں

ایک نئی ہل چل مچ جاتی ہے اور بہت سے نر کام چھوڑ چھاڑ ان خاتونوں کو لبھانے کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور ان کے ساتھ ایک شاخ سے دوسری شاخ پر پھدکتے پھرتے ہیں۔ اور دلچسپ ننھے بازو پھڑپھڑا کر گاتے جاتے ہیں۔ مادیوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے آپس میں بڑا مقابلہ رہتا ہے اور کامیابی غالباً چونچوں کی تیزی یا خوش گلوئی (اچھی آواز) پر ہوتی ہے۔ مگر مادیوں پر بظاہر اس جوش و خروش کا مطلق اثر نہیں ہوتا۔ ہر مادہ بلا تکلف ایک ایک گھونسلے کو اندر اور باہر سے جانچتی ہے۔ کوئی گھونسلا پسند آگیا تو بغیر کسی سے پوچھے گچھے قبضہ کر لیتی ہے اور گھونسلے کے ساتھ بنانے والا بھی اس کا ہو جاتا ہے اب میاں بیوی مل کر گھونسلا مکمل کرتے ہیں۔ میاں باہر کام کرتا ہے اور بیوی اندر کا حصہ سجاتی ہے۔ گھونسلا مکمل ہوتے ہی انڈے دیئے جاتے ہیں۔ اور مادہ انڈے سینے بیٹھ جاتی ہے۔ نر انڈوں پر نہیں بیٹھتا بلکہ جیسے ہی ایک مادہ کو انڈوں پر بٹھا دیتا ہے دوسرا گھونسلا بنانا شروع کر دیتا ہے اور مکمل ہونے سے پہلے دوسری مادہ کو لبھانے کی فکر کرتا ہے اس طرح ایک نر تین چار ماداؤں کو گھونسلوں میں بٹھا دیتا ہے۔ چنانچہ نئی تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ برخلاف پرانے خیال کے بیا کئی بیویاں کرتا ہے۔ یعنی دو سے چار تک۔ مگر ایک مادہ کا گھر بنا کر اور اسے آرام سے انڈوں پر بٹھا کر دوسری طرف متوجہ ہوتا ہے۔ جب تک آرام و آسائش کا سامان پورا نہ ہو جائے نئی بیوی نہیں ملتی۔

کبھی کبھی مادنیں دو دو تین تین گھونسلوں میں اندر جاتی اور باہر نکل آتی ہیں اور آخر کسی تیسرے چوتھے گھونسلے میں جا کر بیٹھ جاتی ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے کے گھونسلے انہوں نے ناپسند کر دیئے اس ناپسندیدگی کی وجہ گھونسلے میں کوئی نقص یا خرابی ہوتی ہے جسے ہم غور سے دیکھ کر بھی معلوم نہیں کر سکتے۔ نئی آبادیوں میں ایسی بہت سی جھونجھیں نامکمل رہ جاتی ہیں۔ اکثر انھیں توڑ کر نیچے کو پھینک دیتے ہیں اور کبھی یہ اپنی قسمت پر چھوڑ دی جاتی ہیں اور نر انھیں چھوڑ کر نئی جھونجھ بنانے پر مستعد ہو جاتے ہیں۔ پرانی کتابوں میں لکھا ہے کہ یہ جھونجھ اپنے آرام کے لئے بناتے ہیں جہاں وہ رات کو سوتے یا بارش سے پناہ لیتے ہیں۔ مگر یہ صحیح نہیں کیونکہ نر بیئے رات کو نئی آبادی میں کبھی بسیرا نہیں لیتے بلکہ اس سے بہت فاصلے پر یہاں تک کہ کبھی کبھی میلوں دور لانبی گھاس یا نرکل میں ہزاروں کی تعداد میں جا رہتے ہیں مادائیں انڈوں پر بیٹھ جاتی ہیں تو وہ اس نئی آبادی میں تنہا رہنا پسند کرتی ہیں۔

آخر میں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ بیوں کی کہانیوں میں جن پر شاعر یا خیالی پلاؤ پکانے والے دل دادہ ہیں۔ یہ داستان بھی محض خیال ہی خیال ہے کہ بیئے جگنو پکڑ کر اپنے گھروں کو ان سے روشن کرتے ہیں کیونکہ مرے ہوئے جگنو میں روشنی نہیں رہتی اور اگر (جیسا کہ خیال ہے) یہ جگنو گیلی مٹی سے جھونجھ کے اندر چپکائے جائیں تو جلد مر جائیں۔ ان کی حالت تو اس بیٹری کی ہوگی جس کی بجلی ختم ہو چکی ہو۔ نئی جھونجھ میں ضرور پائی جاتی ہے۔ مگر جو بات اب تک مشاہدے میں نہ آئی اُسے واقعے کے طور پر پیش کر دینا کوئی معنی نہیں رکھتا ٭

میرا بچپن

از حضرت جوش ملیح آبادی مدظلہٗ

ہر چند ہے اب عمر کی چونتیسویں منزل
وہ دن ہے نہ وہ رات، نہ وہ سن ہے نہ وہ دل
یاد آتا ہے اب بھی مجھے لیکن وہ زمانہ
جس وقت سفر کے لئے ہوتا تھا روانہ
ڈیوڑھی کی طرف سر وہ جھکائے ہوئے چلنا
جاتے ہوئے قرآن کے نیچے سے نکلنا

بچپن کی یاد

دوڑا یوں دیکھ کر مجھے سجّاد[1] — جیسے چھوٹے کڑی کماں سے تیر
آکے زانو پہ میرے بیٹھ گیا — اور کچھ اس طرح سے کی تقریر
پھر گئی جوش میری آنکھوں میں
اپنے مرحوم باپ کی تصویر

۱؎ سجاد میرے لڑکے کا نام ہے

ہم کیا کھائیں

از جناب ڈاکٹر سید صاحب بریلوی

کھانے کا نام آتے ہی بہت سے صاحب زادوں کے منہ میں پانی بھر آیا ہوگا۔ بعضوں کو ایسا معلوم ہوا ہوگا کہ منہ میں حلوا سوہن یا بالوشاہی کی ڈلی آگئی۔ بعض کو دہی بروں کا یا کچالوؤں کا ذائقہ محسوس ہونے لگا ہوگا۔ اور بعض کو قورمے بریانی یا پوری کچوری کی خوشبو آنے لگی ہوگی بدقسمتی سے اس کاغذی دسترخوان پر تمھارے لئے میں اس قسم کے کھانے چننے سے تو معذور ہوں البتہ اتنا کرسکتا ہوں کہ تمھیں یہ بتادوں کہ بڑے بڑے ڈاکٹروں نے اب تک جو تجربے کئے ہیں اُن کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ اور اُن کی رائے میں کس قسم کی غذا اچھی ہے۔ اور کون سی بُری۔

تم یہ ضرور کہو گے کہ ان کمبخت بے وقوف اور بدمذاق ڈاکٹروں کی بات کا کیا اعتبار۔ وہ تو آدمی کو کونین جیسی کڑوی اور ارنڈی کے تیل جیسی بدذائقہ دوائیں کھلایا اور پلایا کرتے ہیں۔ لیکن ہر چیز جو ظاہر میں کسی قدر بُری نظر آئے اُسے بُرا ہی نہ سمجھ لینا چاہیئے۔ یہ بے وقوف ڈاکٹر بھی بعض باتیں کام کی بتادیتے ہیں۔ مثلاً اگر وہ تمھیں یہ بتادیں کہ اس قسم کی غذائیں کھانے سے زیادہ تندرست، زیادہ موٹے تازے اور زیادہ خوش رہ سکتے ہو اور اپنے ساتھیوں میں سے بہت سوں کو اپنی طاقت سے نیچا دکھا سکتے ہو تو یہ تو ضرور ایک کام کی بات ہے۔ اسی طرح اگر وہ یہ بھی بتادیں کہ کون کون سی غذائیں تمھارے لئے فضول ہیں اور کم زور کرتی ہیں اور

تمھارے بدن میں اتنی طاقت نہیں چھوڑتیں۔ کہ تم بیماری کا مقابلہ کر سکو جس کی وجہ سے تم رات دن بیمار رہتے ہو۔ تو یہ بھی ایک اچھی ہی بات ہوگی اس لئے مناسب ہی معلوم ہوتا ہے کہ ان بد مذاق لوگوں کی بات بھی سُن لی جائے۔ کان میں پڑی ہوئی بات، جیب میں پڑا ہوا پیسا اور پیٹ میں پڑی ہوئی روٹی کبھی نہ کبھی کام آہی جاتی ہے۔

تم میں سے اب اکثر کی یہ خواہش ہوئی ہوگی۔ اور ممکن ہے کہ بعض نے اپنے ننھے ننھے ہاتھ دُعا مانگنے کے لئے اُٹھا بھی دئے ہوں گے کہ اللہ کرے ڈاکٹر صاحب مٹھائیوں اور پھلوں، اور چاٹ کو اچھا بتائیں۔ تو پھر ہم روز ابا جان سے ان چیزوں کے لئے پیسے لیا کریں اور خوب کھایا کریں" مگر بھائی بات یہ ہے کہ تم سب میں آپس میں اتفاق نہیں ہے کوئی مٹھائی پسند کرتا ہے، کوئی پھل، کوئی پلاؤ، اور کوئی خستہ کچوریاں۔ اور پھر پھلوں اور مٹھائیوں میں بھی اختلاف موجود ہے۔ کسی کو آم اچھے لگتے ہیں۔ کسی کو انگور پسند ہیں اور اسی طرح کسی کو جلیبیاں بھاتی ہیں اور کسی کو گلاب جامنیں۔ یہ بھی دیکھا ہے کہ امرتیاں ایک شخص کو تو بہت اچھی معلوم ہوتی ہیں اور دوسرا اُن سے اس قدر چڑتا ہے کہ اس کے سامنے اگر اُن کا نام لے دیا جائے تو مارنے کو دوڑتا ہے۔ ایسی حالت میں کسی پھل یا مٹھائی کے متعلق اگر یہ کہہ بھی دوں کہ وہ بہترین غذا ہے تو اس سے سب لوگ تو خوش نہیں ہو سکتے اس لئے یہ مناسب ہوگا کہ مختلف مقامات کے لوگ جس قسم کی غذائیں کھاتے ہیں۔ اِن کے متعلق تھیں یہ بتا دیا جائے کہ فلاں صوبے یا فلاں ملک کے آدمی جو غذائیں کھاتے ہیں وہ اچھی ہیں۔ اس میں پھر تمھاری پسند کی بھی ساری چیزیں آجائیں گی۔

ایک بہت بڑے ڈاکٹر ہیں میجر جنرل مکاریسن، وہ ایک مدت سے یہی تجربے کر رہے ہیں کہ انسان کی پرورش کے لئے کون سی غذائیں زیادہ اچھی ہیں۔ ہزار ہا چوہے اور خرگوش انھوں نے پال رکھے ہیں اور بیس بیس چوہوں کی جماعت بنا کر انھیں الگ الگ پنجروں میں رکھا ہے۔ ایک پنجرے کے بیس چوہے گویا ایک ملک یا ایک

صوبے کے انسان ہیں۔ تجربے کے لئے تمام چوہے
ایک ہی نسل کے اور ایک سی عمر کے لئے جاتے
ہیں۔

اب سارے تجربوں کا حال تو میں کہاں
تک سناؤں۔ انھوں نے ایک تجربہ یہ کیا تھا
کہ بیس چوہے ایک پنجرے میں رکھے اور انھیں
معمولی انگریزی خوراک دینی شروع کی معمولی
سے یہ مطلب ہے کہ ایسی خوراک جو انگلستان
کے غریب آدمی کھاتے ہیں۔ اس خوراک میں یہ
چیزیں شامل تھیں:۔ میدے کی ڈبل روٹیاں
مصنوعی مکھن جسے مارگیورین کہتے ہیں۔ تیز میٹھی
چا جس میں بہت ذرا سا دودھ ہو، ابلی ہوئی
بند گوبھی، ابلے ہوئے آلو، ٹین کے ڈبوں میں بند
ہو کر جو بکتا ہے وہ گوشت اور سستے قسم کے مربے
اسی طرح اسی نسل اور اسی عمر کے بیس چوہے لے
کر انھیں دوسرے پنجرے میں رکھا اور انھیں وہ
خوراک دی جو شمالی ہندوستان خاص کر پنجاب
میں عام طور پر کھائی جاتی ہے۔ اِس
خوراک میں یہ چیزیں تھیں:۔ چپاتی روٹیاں، دالیں
سبز ترکاریاں اور دودھ۔

دیکھنا یہ منظور تھا کہ انگریزی خوراک کھانے
والے چوہے زیادہ تندرست رہتے اور موٹے
تازے ہوتے ہیں۔ یا ہندوستانی خوراک کھانے
والے آپ سب اپنے دل میں یہ سمجھ رہے
ہوں گے کہ انگریزی خوراک والے چوہے
زیادہ تندرست اور موٹے ہو گئے ہوں گے
کیوں کہ آپ روزمرہ دیکھا کرتے ہیں کہ انگریز
عام طور پر موٹے تازے اور تندرست ہوتے
ہیں۔ لیکن چوہوں کو وہ غذا نہیں دی گئی تھی جو
ہندوستان میں رہنے والے انگریز کھاتے ہیں۔
انھیں تو وہ غذا دی تھی جو انگلستان کے غریب
آدمی کھاتے ہیں۔ خیر اب نتیجہ سنو۔

دیکھا یہ گیا کہ ہندوستانی خوراک والے
چوہے شروع ہی سے بہت خوش و خرم۔ بہت
تندرست اور بہت کھلاڑ نظر آئے۔ ان کے جسم
خوب موٹے ہو گئے۔ قد بھی جلدی سے بڑھ گئے
اور بدن کی کھال خوب چمکنے لگی۔ اُن میں آپس
میں کبھی لڑائی بھی نہ ہوتی تھی۔ اور نہ ان میں سے

کوئی بیمار ہوتا تھا۔ ان میں سے صرف ایک چوہا تو ایک اتفاقی حادثے سے مرگیا۔ اور دو چوہوں کو سردی کی وجہ سے۔ نیومونیا ہوگیا، کیوں کہ انھیں اوڑھنے بچھانے کو کچھ نہیں دیا گیا تھا۔

انگریزی خوراک والوں میں یہ بات دیکھی گئی کہ ان کا وزن نہیں بڑھتا تھا جس کے یہ معنی تھے کہ ان کا بدن دیسے کا ویسا ہی رہا اور وہ موٹے نہ ہوئے۔ اُن کے قد بھی چھوٹے چھوٹے رہ گئے اُن کے بدن بھی خوب صورت اور سڈول نہ ہوسکے۔ اُن کی کھال پر ذرا بھی چمک نہ تھی کھال خشک اور کھردری سی ہوکر رہ گئی تھی، چند ہی روز گذرے تھے کہ وہ چڑچڑے اور بدمزاج بھی ہوگئے۔ اور کھانا دینے والے خدمت گاروں کو کاٹنے لگے۔ آپس میں بھی اُن کے تعلقات اچھے نہ رہے۔ روز لڑائیاں رہتی تھیں اور ساٹھویں دن تو یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ جو سب سے کم زور تھا اسے باقی سب نے مل کر مار ڈالا اور کھا گئے اب روز یہی ہونے لگا کہ جو کم زور ہوتا وہ نوش کرلیا جاتا۔ ڈاکٹر مکاریسن نے جب یہ حالت دیکھی اور تین چوہے اس طریقے پر پیٹ میں پہنچ گئے۔ تو مجبوراً باقیوں کو انھوں نے الگ الگ پنجروں میں رکھا۔

ایک سو نوے دن یعنی چھ مہینے سے کچھ زیادہ دنوں تک یہ تجربہ جاری رہا۔ اس کے بعد دونوں جماعتوں کے چوہوں کو مار ڈالا گیا اور اُن کی لاشوں کا بغور معائنہ کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ ہندوستانی خوراک والے چوہوں میں سے ایک کو بھی اعصاب کی سوزش کا مرض نہیں ہوا تھا اور انگریزی خوراک والوں میں اس کے دو مریض تھے یہ بیماری اس بات کی خاص علامت ہوتی ہے کہ غذا میں ایسی چیزیں کم ہیں جن سے بدن کی پرورش ہوتی ہے۔ پھیپھڑوں کی بیماری میں بھی جتنے ہندوستانی چوہے مبتلا تھے اُن سے دُگنے انگریزی چوہے مبتلا تھے۔ پیٹ کی بیماری ہندوستانی چوہوں میں بالکل نہ تھی۔ انگریزی چوہوں میں اس کی بھی کثرت تھی۔

ڈاکٹر مکاریسن نے اس قسم کا تجربہ کرکے

شمالی ہندوستان اور جنوبی ہندوستان کی خوراک کا مقابلہ کیا تھا۔ جنوبی ہندوستان میں مشین کا بنا ہوا چاول کثرت سے استعمال ہوتا ہے۔ اس تجربے میں بھی یہی دیکھا گیا ہے کہ جنوبی ہند کے چوہوں کی قریب قریب وہی حالت ہوئی جو انگریزی چوہوں کی ہوئی تھی۔

مکاریسن نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ انگلستان یا جنوبی ہندوستان میں جو غذا عام طور پر کھائی جاتی ہے اس سے بدن کی پرورش نہیں ہوتی۔ اور خاص کر پھیپھڑوں کی اور پیٹ کی بیماریاں ہو جاتی ہیں۔ شمالی ہندوستان میں جو غذا کھائی جاتی ہے۔ اس سے بدن کی پرورش بھی اچھی طرح ہوتی ہے۔ اور بیماریوں سے بھی بہت کچھ حفاظت ہو جاتی ہے۔

ان تجربوں سے ایک نتیجہ میں نے بھی نکالا ہے اور وہ یہ کہ اگر کافی غذا نہ ملے تو انسان چڑچڑا بدمزاج اور جھگڑالو، اور خونخوار ہو جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں ہندو مسلمانوں کی آپس کی لڑائی کا اصلی سبب یہی ہے۔ کہ ہم بھوکے مرتے ہیں۔ اگر پیٹ بھر روٹی ملنے لگے تو یہ ساری لڑائیاں بند ہو جائیں



علی کمال زندہ باد

شیخ عطاء اللہ صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

خالدہ خانم کا نام تم نے سنا ہوگا۔ جامعہ ملیہ کی بدولت ہندوستان والوں کو ہمارے زمانے کی اس بے مثال عورت کی زیارت نصیب ہوئی۔ اُن کی زندگی کے حالات اور اُن کے بے شمار کمالات کے ذکر کا تو اس وقت موقع نہیں۔ تمھیں اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ انھوں نے انگریزی زبان میں ترکوں کے متعلق چند کتابیں لکھی ہیں۔ ایک کتاب کا نام ٹرکش آرڈیل ہے۔ میری خواہش ہے کہ ملک کا ہر بچہ اس کتاب کو غور سے پڑھے۔ یہ کتاب حقیقت میں موتیوں میں تولنے کے لائق ہے

اس میں خالدہ خانم نے بتایا ہے کہ ترکوں کی مٹھی بھر قوم نے کس طرح زبردست اور ظالم قوموں کے پنجے سے اس وقت رہائی پائی جب وہ ٹرکی پر قبضہ جما چکی تھیں۔ اور اسے فنا کرنے کے سب منصوبے پورے ہو چکے تھے۔

بچے کہانیاں پسند کرتے ہیں۔ دو چار برس پہلے میری دو کہانیاں پیام بھائیوں نے بہت پسند کیں وہ تو محض قصے تھے جو لوگوں نے بچوں کا دل بہلانے کو گھڑ رکھے ہیں آج تمھیں خالدہ خانم کی اس کتاب سے ایک سچا واقعہ سناتا ہوں اور سچ پوچھو تو اس ایک واقعے پر ساری الف لیلہ نثار ہے۔

یونانیوں نے ٹرکی پر زبردست حملہ کیا ٹرکی دم توڑ رہی تھی۔ دشمنوں کے نرغے میں پھنسی تھی۔ لیکن قوم کی غیرت زندہ تھی۔ اور قوم کا ہر شخص غلامی کی زندگی سے موت کو بہتر سمجھتا تھا

یونانی اپنی ایک بھاری بھر کم توپ ایک خاص مقام پر لے جانا چاہتے تھے۔ اتفاق سے راستے میں توپ بے کار ہوگئی اور مرمّت کی ضرورت پیش آئی۔ یونانی فوج کے ساتھ اس وقت کوئی آدمی توپ کی مرمت کرنے والا موجود نہ تھا دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ قریب کے ایک شہر میں علی کمال ایک ترک انجینیر موجود ہے۔ سپاہی علی کمال کے پاس پہنچے اور اس سے کہا چل کر ہماری توپ درست کردو۔ علی کمال ترک تھا۔ یونانی ملک کے دشمن! علی کمال پاشا جانتا تھا کہ توپ کہاں رکھی جائے گی۔ یہ بھی اسے معلوم ہی تھا کہ یہ توپ وہ آگ برسائے گی کہ اس کے بھائی بندوں کو بھون ڈالے گی اور اس کے ملک کو غیروں کا غلام بنانے میں مدد دے گی۔ علی کمال کسی بہانے گھر سے بھاگ گیا۔ لیکن اپنے دوست کو اپنا پتہ بتاتا گیا۔ کہ اگر سپاہی اُس کی بیوی بچوں کو دق کریں تو اس کو اطلاع مل جائے۔ جب علی کمال کو معلوم ہوا کہ اس کے خاندان کو یونانیوں نے قید کرلیا ہے تو وہ جھٹ واپس پہنچا اور سپاہیوں سے کہا میری بیوی اور بچوں کو چھوڑ دو تو تمھاری ایک نہیں دس توپیں درست کردوں گا۔ صرف اتنا ہی نہیں چلا کر بھی دکھادوں گا۔ علی کمال پورے اطمینان سے بیوی بچوں سے رخصت ہوا۔ اس نے بیوی سے کہہ دیا کہ بچے کو اپنے باپ کے ہاں لے کر چلی جائے اور اس کا انتظار نہ کرے۔

توپ درست ہوئی، چلائی گئی۔ راستہ خراب تھا۔ یونانیوں نے کہا کہ توپ فلاں مقام پر پہنچ کر چلائی جائے گی اور جب وہاں ٹھیک ہے تو تمھیں جانے کی اجازت ہوگی۔ علی کمال نے کہا مجھے واپسی کی تو کچھ جلدی نہیں۔ میں بھی ذرا اپنی کاری گری کی داد چاہتا ہوں۔ مجھے بھی تو اس توپ کی مار دیکھنا ہے۔ بھاری بھر کم توپ کے آگے گھوڑے جُتے تھے۔ علی کمال کو توپ پر بٹھایا گیا۔ مگر اس شان سے کہ یونانی سپاہی پستول لئے دائیں بائیں اور پیچھے بیٹھے تھے۔ راستہ ایک بلند پہاڑ پر سے ہو کر جاتا تھا۔ جب توپ سب سے بڑی بلندی پر پہنچی تو علی کمال نے جو پہلے ہی سمجھ

بیٹھا تھا کہ اس توپ کی مرمت ترکوں کو اپنے ہاتھ سے قتل کرنا ہے۔ بجلی کی تیزی کے ساتھ لپکا گھوڑوں کی باگیں سپاہیوں سے چھین لیں اور قیامت کی پھرتی کے ساتھ گھوڑوں کو سڑک پر سے ہٹا ایک غار کی طرف ڈال دیا اس کا انجام ظاہر تھا نہ گھوڑے بچے، نہ توپ نہ سپاہی نہ علی کمال۔ دنیا نے ایک گہرے کھڈ میں ایسا قیمہ دیکھا جو زمین کے ساتھ ملیدہ کی طرح جما ہوا تھا۔ علی کمال نے جان دے کر ترکوں کو زندہ کر دیا۔ ترک بے بس، بیمار و بے کار، فاقہ کش اور نادار تھے۔ لیکن اُن کے دل وطن اور قوم کی محبّت سے بھرپور تھے

اور ظاہری اسباب کو دیکھنے والی دنیا نے حیرانگی سے دیکھا کہ ان گنتی کے ترکوں نے پوری بے سر و سامانی میں دنیا کی بڑی بڑی مغرور اور ہتھیار بند سلطنتوں کو بڑی ہی ذلت کے ساتھ اپنے ملک سے نکال باہر کیا اسی زمانے میں لوگ دعا مانگا کرتے تھے "خدایا مصطفےٰ کمال کی فوج میں اپنی نصرت (مدد) کے فرشتے بھیج دے"۔ مولانا ابو لکلام کہا کرتے ہیں "دنیا کے کام فرشتے نہیں انسان ہی انجام دیا کرتے ہیں اور یہی بات بھی یہی معلوم ہوتی ہے کہ خدا وقت پڑے پر انسانوں ہی سے فرشتوں کے کام لے لیا کرتا ہے"

"علی کمال زندہ باد"

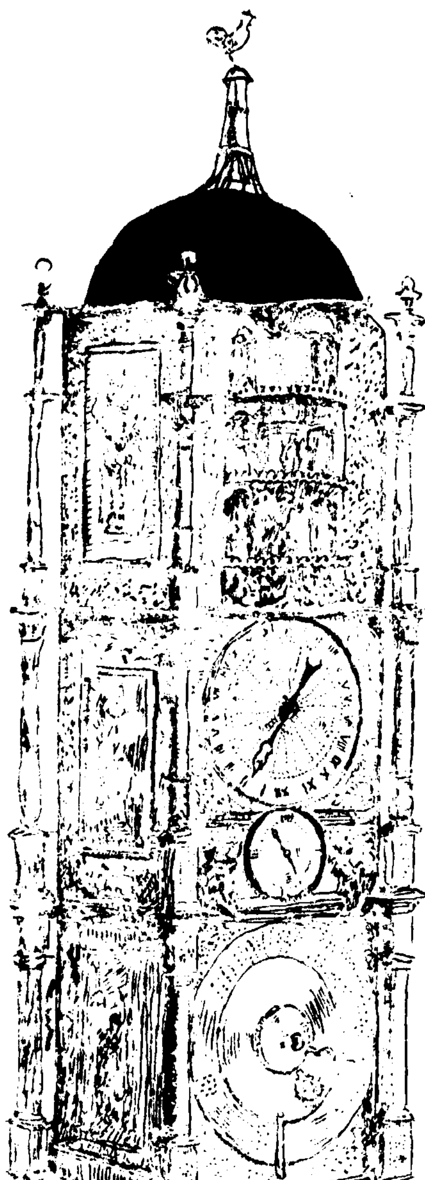
گھڑی

از جناب برکت علی صاحب متعلم جامعہ

کیوں بھئی تمھارے پاس گھڑی بھی ہے۔ تمھارے پاس نہیں تو تمھارے ابّا کے پاس تو ضرور ہوگی۔ نہیں تو تم روزمرہ بہت سے لوگوں کے پاس تو دیکھتے ہی ہوگے۔ اُن کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ جو پیسے پیسے میں بکتی ہے اور تمھارے بھائی بہن کلائی پر باندھے اکڑتے پھرتے ہیں۔ شاید بچپن میں تمھارا بھی یہی شغل ہو۔ مگر یہ صرف دل بہلاوے اور کھیل کی چیز ہے۔ اصلی گھڑی وہ ہے جس سے تم وقت معلوم کرسکتے ہو۔ اور جسے دیکھ کر تم وقت پر مدرسے پہنچ سکتے ہو۔ اس کی مدد سے تمھارے اور تمھارے کیا ساری دنیا کے کام ٹھیک وقت پر انجام پاتے ہیں۔

یہ گھڑی بھی کئی طرح کی ہوتی ہے۔ ایک تو کلائی پر باندھنے کی دوسرے جیب گھڑی، تیسرے ٹائم پیس جو میز پر رکھتے ہیں۔ چوتھے بڑی گھڑی یا کلاک جو دیواروں پر لگاتے ہیں۔ ایک گھڑی اور بھی ہوتی ہے۔ یہ تم نے بڑی عمارتوں یا گھنٹہ گھر پر دیکھی ہوگی۔ غرض قسم قسم کی گھڑیاں ہیں اور نت نئی شکل کی۔ تم سمجھتے ہوگے کہ یہ گھڑیاں ہمیشہ سے ایسی ہی ہوں گی۔ مگر یہ بات نہیں ہے۔ بہت دنوں کی ترقی کے بعد انھوں نے یہ شکل اختیار کی ہے۔ ترقی کی یہ داستان بہت دلچسپ ہے۔

ہمارے دادا اور پردادا سے بھی ہزاروں برس پہلے،

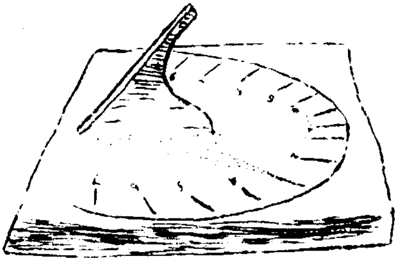


اسٹراس برگ کا گھنٹہ گھر

اس وقت کی گھڑیوں کا تو تصور بھی لوگوں کے دماغ میں نہیں آ سکتا تھا۔ بلکہ ان بے چاروں کو تو دن اور رات کا بھی ٹھیک سے اندازہ نہیں تھا۔ پھر آہستہ آہستہ نہ جانے کیوں کر ان کے دل میں خیال آیا کہ دن ایک صبح سے دوسری صبح تک مقرر کیا جائے یا ایک دوپہر سے دوسری دوپہر تک۔ یونان کے لوگوں نے اس میں اور ترقی کی کہ سورج نکلنے سے چھپنے تک دن ہوگا اور سورج چھپنے کے بعد پھر نکلنے تک رات۔ اس دن اور رات کو انھوں نے بارہ بارہ حصوں یا گھنٹوں میں تقسیم کیا۔ اب اگر دن بڑا ہے تو گھنٹے بھی بڑے ہوں گے، دن چھوٹا ہے تو گھنٹے بھی چھوٹے۔ فرض کرو تم اپنے مدرسے میں تین گھنٹے پڑھتے ہو تو جاڑوں میں تو یہ گھنٹے چھوٹے ہوں گے۔ اور گرمیوں میں بہت لمبے۔ اس دقت کو محسوس کر کے دن اور رات کو چوبیس حصوں یا گھنٹوں میں تقسیم کیا اس طرح حساب ٹھیک ہوگیا۔

جیسے جیسے انسان کے رہنے سہنے کے طریقوں میں ترقی ہوئی اسے یہ خیال بھی پیدا ہوا کہ وہ مختلف وقتوں میں مختلف کام انجام دے۔ لیکن صحیح طور پر وقت کیسے معلوم ہو سوچتے سوچتے اُن کی سمجھ میں یہ آیا کہ یہ کام سورج سے لیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ آدمی، سب سے پہلے سورج ہی سے وقت کا اندازہ کیا کرتا تھا۔ بعض جگہ اب تک چرواہے جنگلوں میں وقت کا اندازہ سورج ہی سے کرتے ہیں۔ اس کے بعد لکڑی زمین میں گاڑ دیتے تھے۔ اور اس کے سایہ سے وقت معلوم کرتے تھے۔

اس کے بعد سورج کے ذریعے وقت معلوم کرنے کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ یعنی ایک پلیٹ یا ڈائل پر ۱۲ تک ہندسے لکھے ہوتے تھے۔ ڈائل پر لمبی سی سوئی کی طرح کی ایک چیز ہوتی تھی۔ جیسے جیسے سوئی کا سایہ ڈائل پر کھسکتا تھا۔ اسی اندازے سے وقت کا اندازہ لگتا تھا۔ اس کا نام دھوپ گھڑی یا سن ڈائل تھا۔ یہ اب بھی بعض پرانے باغوں گرجوں اور مسجدوں میں پائی جاتی ہے۔

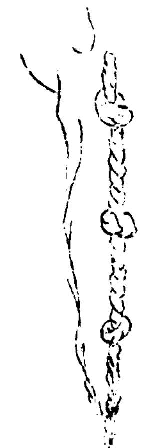


(معمولی دھوپ گھڑی یا سن ڈائل جو مسجدوں اور گرجوں میں لگایا جاتا ہے)

مگر دھوپ گھڑی یا چاند گھڑی اسی وقت کام دے سکتی تھی جب آسمان صاف ہو اور بادل نہ گھرے ہوں اس لئے بعض اور طریقوں کا بھی رواج ہوگیا۔ مثلاً آج سے ہزاروں برس پہلے۔ چین اور جاپان میں رسی کی گانٹھوں سے وقت معلوم کرتے تھے۔ بھلا کچھ بتا سکتے ہو کہ رسی کی گانٹھوں سے وقت کیسے معلوم ہو جاتا تھا۔ کرتے یہ تھے کہ ایک لمبی سی رسی میں برابر برابر فاصلے پر گانٹھیں لگا دیتے تھے۔ اور ایک سرا جلا دیتے تھے جب ایک گرہ سے دوسری گرہ تک جل جاتی تو معلوم ہو جاتا کہ اتنا وقت گذر گیا۔ یہ طریقہ تھا تو آسان اور صحیح مگر اس میں بھی دشواریاں تھیں۔ مثلاً یہ کہ کوئی اسے ساتھ نہیں رکھ سکتا تھا۔

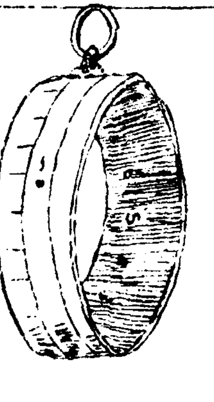
اس دشواری کو دور کرنے کے لئے دھوپ گھڑی

میں اصلاحیں کی گئیں اور ایسے چھوٹے چھوٹے سن ڈائل بنائے گئے جنھیں انسان اپنے ساتھ بھی رکھ سکتا تھا۔



اس کے علاوہ پانی کی گھڑی بھی ایجاد ہوئی۔ اس کی دو قسمیں تھیں ایک تو یہ کہ پیالے میں سوراخ کر کے اس میں پانی بھر دیا جاتا تھا۔ سوراخ سے پانی قطرے قطرے کر کے دوسرے مرتبان میں گرتا تھا۔ اس نیچے کے مرتبان کی شکل دوا پینے کے گلاس کی سی ہوتی تھی۔ اس میں نشان بنے ہوتے تھے۔ (رسی گھڑی)

پانی جتنے نشان تک پہنچ جاتا تھا سمجھا جاتا تھا کہ دن کے اتنے گھنٹے گذر چکے۔ دوسری صورت یہ تھی کہ بڑے برتن میں پانی بھر کر ایک چھوٹا برتن جس کے پیندے میں سوراخ تھا۔ اُس میں ڈال دیتے تھے۔ اس برتن میں رفتہ رفتہ پانی بھر جاتا تھا اور یہ ڈوب جاتا تھا۔ اس وقت گویا ایک گھنٹہ پورا ہو گیا۔ اس قسم کی ان گھڑیوں کا رواج ہزاروں برس پہلے مشرق کے ملکوں میں تھا اور ہندوستان میں اب بھی کہیں کہیں ہے۔ یہ گھڑیاں آواز بھی دیتی تھیں۔ آواز کے لفظ سے تمھیں تعجب ہو گا۔ یہ آواز ایسی نہیں ہوتی تھی جیسی آج کل کی دیوار گھڑیوں کی۔ بلکہ آواز دینے والا ایک چھوٹا سا لڑکا ہوتا تھا۔ یہ گھڑیاں بازار میں یا آبادی کے بیچ میں ہوتی تھیں۔ اور لڑکا جب دیکھتا تھا کہ پانی مرتبان کے ایک نشان تک بھر چکا یا پیالہ پانی میں ڈوب گیا تو وہ بڑے نقارے کو بجا دیتا تھا۔ اور لوگوں کو معلوم ہو جاتا کہ اتنا وقت گذر گیا۔



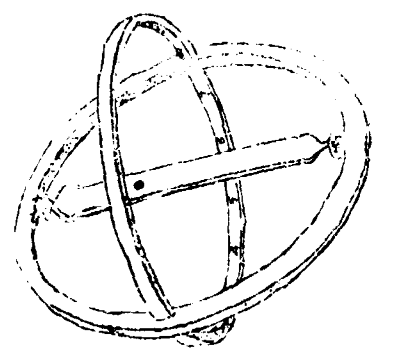
یہ دھوپ گھڑی زمین پر رکھ دی جاتی ہے اور دھوپ سوراخ الف سے گذر کر کسی ہندسے پر پڑتی ہے جس سے وقت معلوم ہوتا ہے

ریت گھڑیوں یا وقت معلوم کرنے کے شیشوں کا بھی کافی رواج تھا۔ آج کل بھی یہ گھڑیاں انڈا ابالنے کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔ یہ شیشے کے چھوٹے قمقمے ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے۔ ریت والا قمقمہ اوندھا کر دیا جاتا ہے اس میں سے تھوڑی تھوڑی ریت دوسرے قمقمے میں گرتی رہتی ہے کوئی تین یا ساڑھے تین منٹ میں ساری ریت دوسرے قمقمے میں چلی جاتی ہے اور اس وقت یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ انڈا ابل گیا۔ ریت گھڑیاں (جو وقت معلوم کرنے کے لئے بنائی جاتی تھیں) انڈا گھڑی سے بڑی ہوتی تھیں۔ شکل ہو بہو ویسی ہی۔ ریت کی مقدار سے وقت کا اندازہ کر لیتے تھے۔ سورج گھڑی کی طرح بہت پرانے گرجوں



جاپانیوں کا لیمپ کلاک جس میں تیل جلانے وقت معلوم ہوتا ہے

میں ریت گھڑیاں بھی اب تک موجود ہیں۔ یہ زیادہ تر منبر کے قریب ہوتی تھیں تاکہ تقریر کرنے والا آسانی سے معلوم کرسکے کہ اس کا وقت ختم ہوگیا۔ ننھے ننھے بچے اکثر اس گھڑی کے پاس آ بیٹھتے تھے اور ٹکٹکی لگائے اس کی طرف دیکھتے رہتے تھے



یہ ایک پرانی دھوپ گھڑی ہے وقت دیکھنے کے لئے اسے کنڈے پکڑ کر لٹکا دیتے تھے اس میں بھی سوراخ سے دھوپ گذر کر ہندسے پر پڑتی ہے۔

کنگ الفریڈ نے وقت معلوم کرنے کے لئے موم بتی میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر رنگین حلقے بنائے تھے موم بتی آہستہ آہستہ جل کر اُن حلقوں تک آتی تھی اور اس سے وقت کا اندازہ کیا جاتا تھا۔

مسلمانوں نے بھی گھڑی بنانے میں بہت ترقی کی تھی۔ پنڈولم یا لنگر کا استعمال بھی عربوں ہی نے کیا مشہور خلیفہ ہارون رشید نے شاہ فرانس، شاہ ریلمان کو تحفے میں ایک گھڑی بھیجی تھی۔ پیتل کے گولے تانبے کے ایک دائرے پر گرتے تھے اور اُس سے آواز پیدا ہوتی تھی انھوں نے ایسی پنڈولم والی یا لنگر دار گھڑیاں بنائی تھیں۔ جو پانی کی گھڑی سے بالکل علحدہ تھیں۔ دمشق کی مسجد کی ایک گھڑی کا حال تم دلچسپی سے سنوگے۔

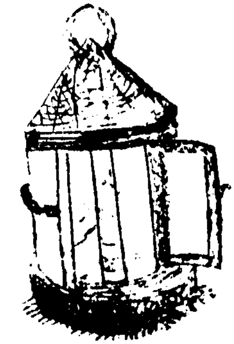
" جس وقت جے روم کے دروازے سے نکلو تو سیدھے ہاتھ کی غلام گردش کی دیوار میں ایک بڑا سا گول طاق نظر آتا ہے اس طاق میں تانبے کے دو گول دائرے ہیں۔ ان میں اتنے ہی گول گول روزن کٹے ہیں جتنے دن میں گھنٹے۔ ان کے سوا تانبے کے دو وزن ہیں۔ یہ دھات کے بنے ہوئے دو بازوں کی چونچ میں سے تانبے کے پیالوں میں گرتے ہیں۔ ان پیالوں کے پیندے میں سوراخ ہیں۔ باز اپنی گردنوں کو بڑھا کر دونوں کو پیالے میں چھوڑ دیتے ہیں اور یہ وہ اِس نزاکت سے کرتے ہیں کہ جادو کا گمان ہوتا ہے۔ جس وقت وزن پیالے پر گرتے ہیں تو آواز نکلتی ہے۔ اور اس کے بعد وہ سوراخ میں سے ہو کر دیوار میں چلے جاتے ہیں۔



(ریت گھڑی)

اس کے ساتھ ہی دائرے کا ایک روزن تانبے کے پترے بند ہو جاتا ہے اور یہ عمل اُس وقت تک جاری رہتا ہے۔ جب تک دن کے سب گھنٹے گذر جائیں۔ اور سب روزن بند ہو جائیں۔ رات کے لئے دوسری کل ہے۔ جس محراب میں یہ دائرے نصب ہیں۔ اُسی میں بارہ چھوٹے چھوٹے دائرے تانبے ہی کے اور ہیں۔ اُن کے بیچ میں سوراخ

ہیں جن میں شیشہ لگا ہوا ہے۔ شیشے کے پیچھے ایک چراغ ہے جو پانی کی طاقت سے گھومتا ہے۔ اس کی حرکت گھنٹوں کے مطابق ہے۔ جس وقت ایک گھنٹہ پورا ہو گیا تو چراغ شیشے کے مقابل آجاتا ہے اور دائرے کو روشن کر دیتا ہے اور پھر ایک گھنٹے کے بعد یہی ہوتا ہے اور دوسرا دائرہ روشن ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ کل گھنٹے رات کے گذر جائیں۔

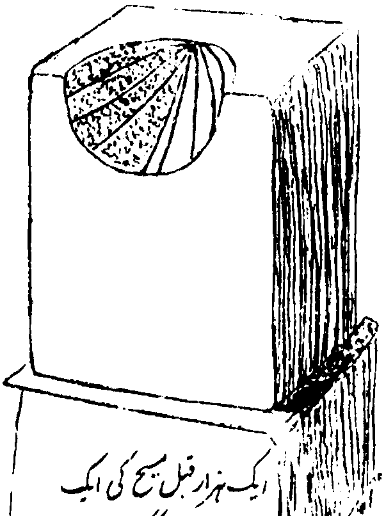


وقت کا اندازہ کرنے کی موم بتی

جوں جوں زمانہ گذرتا گیا۔ گھڑیوں میں اصلاح و ترقی ہوتی گئی۔ لوگوں نے سوئیاں ایجاد کیں جو دائرے کے گرد گھومتی تھیں۔ لیکن آج کل طرح اسپرنگ کی ایجاد تو ہوئی نہیں تھی۔ اس لئے ان سوئیوں کو گھمانے کے لئے کوئی وزنی چیز استعمال کی جاتی تھی۔

رفتہ رفتہ گھڑی بنانے والوں نے عجیب و غریب ایجادیں کیں جو یقیناً دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ عام طور پر مشرق یا ایشیا کے لوگ اس قسم کی عجیب و غریب گھڑیاں بنانے میں بہت کاری گری سے کام لیتے تھے۔ ایک گھڑی کا دلچسپ حال تمھیں سنائیں۔ ہمیں تو بھائی یہ داستان ہی معلوم ہوتی ہے۔ ممکن ہے اس کا کچھ حصہ صحیح بھی ہو۔ اس

گھڑی کے اوپر جنگل کا ایک بہت خوش نما منظر تھا۔ اس جنگل میں چڑیا تھی اور اس کے بچے۔ جنگل میں دس چھوٹے اور دو بڑے دروازے تھے۔ ایک چھوٹا سا چاند بنایا گیا تھا۔ جو آہستہ آہستہ آسمان کے گرد چکر لگاتا تھا۔ ہر گھنٹے کے بعد دو چھوٹے دروازوں میں سے ایک میں آواز پیدا ہوتی تھی اور اس کے ساتھ ہی دو بڑے دروازوں میں سے دو عقاب جھپٹ کر باہر نکلتے تھے۔ ہر ایک دھات کا ایک ٹکڑا تانبے کے ایک کٹورے میں گرا دیتا اور غائب ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد سانپ پھنکارتا ہوا نکلتا تھا اور چڑیا کے بچوں پر حملہ کرتا تھا۔ مگر چڑیا اُسے اپنے ڈینوں سے مار کر بھگا دیتی تھی پھر فوراً وہی دروازہ جس سے آواز پیدا ہوتی تھی کھلتا تھا۔ اور اس سے ایک لڑکی نکلتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک کتاب ہوتی تھی جس پر وہی گھنٹہ لکھا ہوتا تھا جو اس وقت گھڑی میں ہوتا تھا۔ اسی طرح دوسرے گھنٹے بھی معلوم ہوتے تھے



ایک ہزار قبل مسیح کی ایک دھوپ گھڑی

اسی نمونے کی دوسری گھڑی ۱۵۸۹ء میں اسحاق ہاربشٹ (ISSAC HABRECHT) نے تیار کی تھی

جو اسٹراس برگ کی (STRASBURG CLOCK) گھڑی کے نام سے مشہور ہے۔

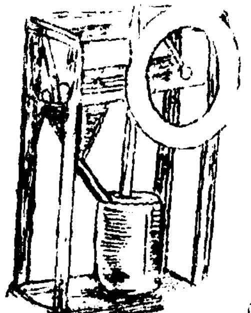
پہلے پہل گھڑیاں بہت چھوٹے پیمانے پر بنائی جاتی تھیں۔ ان کی طرح طرح کی شکلیں اور نمونے ہوتے تھے۔ مثلاً بٹوا، کتاب، پسلیاں، کھوپڑی۔ پھر ان کے ڈبے (کیس) طرح طرح سے سجائے۔ اور قیمتی قیمتی جواہرات سے منڈھے جاتے تھے۔ گھڑی بنانے والوں کا اس زمانے میں مذاق ہی ایسا تھا کہ وہ انہیں جس قدر ہو سکے خوب صورت بنائیں۔



(پن گھڑی)

اکثر اوقات ایسا ہوتا کہ گھڑی کے دائرے یا ڈائل پر ایک سورج اور ایک چاند بنا دیے جاتے۔ جن کی گردش سے وقت معلوم ہو۔ اکثروں میں (دو سپاہی) بنائے جاتے جو اپنی تلواروں کی نوکوں سے گھنٹہ اور منٹ بتاتے تھے۔ جن سے مہینے اور دن بھی معلوم ہوتے تھے۔ مگر ان سب سے حیرت انگیز شکل یہ تھی کہ گھڑی کے اندر ایک باجا ہوتا تھا اور اس کے دائرے پر چھوٹی چھوٹی تصویریں باجے کے ساتھ ساتھ جو وقت اور گھنٹے کی مناسبت سے بجتا تھا۔ ناچتی ہوتی تھیں۔ یہ طریقہ ترمیم و اصلاح کے بعد کچھ نہ کچھ اب بھی باقی ہے۔

شروع شروع میں تمام گھڑیاں ہاتھ ہی سے بنتی تھیں۔ ایک بنچ اور ایک پیر دل والی خراد۔ ایک ہاتھ کا انجن یہی کل سامان تھا جس سے کاری گر دکان میں بیٹھ کر کام کرتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ گھڑیاں بہت خوب صورت ہوتی تھیں۔ لیکن ان کی قیمت بھی بہت ہوتی تھی۔ ایک لکڑی کی گھڑی ۱۸ سے ۴۰ ڈالر؎ تک بکتی تھی۔ اگر پیتل کا کیس ہو تو قیمت ۴۰ سے ۶۰ ڈالر تک ہوتی۔ اس لئے بہت کم لوگ ان گھڑیوں کو خرید سکتے تھے۔ کاری گر بھی ایک وقت میں چند ہی بنا سکتا تھا اور جب وہ بہت سی گھڑیاں بنا لیتا تھا تو ان کے خریدار ڈھونڈھنے کے لئے گھوڑے پر سوار ہو کر سارے ملک میں مارا مارا پھرتا تھا۔ لیکن سنہ ۱۸۰۸ء میں ایک شخص ریلی ٹیری نے گھڑی بنانے کے کام میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اس نے اپنی مشینیں چلانے کے لئے پانی کی طاقت سے کام لیا۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ ایک وقت میں زیادہ گھڑیاں بننے لگیں اور پہلے کے مقابلے میں ان کی قیمت بھی کم ہو گئی۔ تین چار سال کے عرصے میں اس نے اتنی ترقی کر لی کہ اس کے کارخانے میں سالانہ ہزاروں گھڑیاں بننے لگیں۔ پہلے پہل تو لوگ اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ لیکن اس کی کامیابی دیکھ کر آنکھیں کھلیں اور اس کی دیکھا دیکھی اور بھی بہت سے کارخانے کھل گئے۔



(پن گھڑی)

اور اب تو یہ حال ہے کہ امریکا کے بعض کارخانوں میں سال میں ایک لاکھ گھڑیاں بن جاتی ہیں۔

ابھی تین چار سال ہوئے ایک اور گھڑی ایجاد ہوئی ہے اسے جمپنگ فگر کہتے ہیں۔ یہ معمولی گھڑی کے برابر ہوتی ہے؟

؎ ایک ڈالر تین روپے دو آنے کا ہوتا ہے۔

جیبی اور کلائی والی۔ اس میں خاص بات یہ ہے کہ سوئیاں نہیں ہوتیں۔ بلکہ بیچ میں ایک چھوٹی سی کھڑکی ہندسے کی اور اس کے نیچے منٹ کی ہوتی ہے۔ بس جو وقت ہوتا ہے اس کے مطابق گھنٹے اور منٹ کے ہندسے اِن کھڑکیوں میں آجاتے ہیں مثلاً اس وقت ۲ بج کے ۲۷ منٹ ہوئے ہیں۔ تو گھنٹے کی کھڑکی میں "۲" کا ہندسہ ہوگا اور منٹ والی کھڑکی میں ۲۷ کا۔ بعض گھڑیوں میں ایک چھوٹی سی کھڑکی سیکنڈ دکھانے کے لئے بھی ہوتی ہے۔

دیکھو یہ داستان کیسی دلچسپ تھی۔ بہت سی باتیں جن کے بارے میں خیال تھا کہ تم نہ سمجھ سکو گے یا مشکل سے سمجھو گے چھوڑ دی گئی ہیں۔ پھر بھی تمھیں یہ تو معلوم ہو گیا ہوگا کہ گھڑی کی ایجاد کس طرح ہوئی۔ کس طرح اس صنعت نے ہزاروں برس سے اب تک آہستہ آہستہ ترقی کی۔ اور کتنے دماغوں نے اس کی اصلاح و ترمیم میں حصہ لیا اور کتنی مدت میں جا کر اس نے موجودہ شکل اختیار کی۔ ترقی کے قدم ابھی رُکے نہیں ہیں۔ آگے چل کر معلوم نہیں اس میں کیا کیا نئی نئی اصلاحیں ہوں گی۔

ننھی کہانی

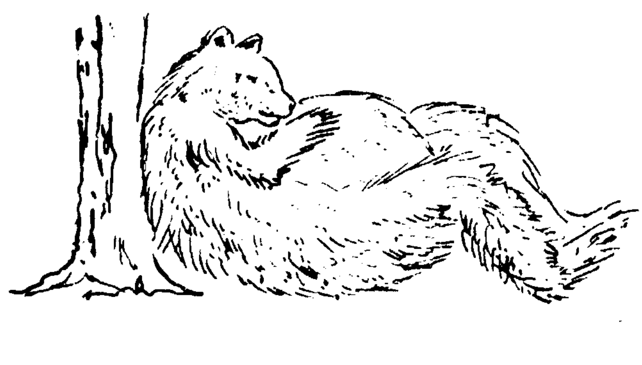
کالو کو ملا بھالو





بھالو کا پیٹ ہوا کپا

بھالو کے پیٹ میں کالو



ریچھ کا تماشا



جناب شفیع الدین صاحب نیر جامعی

میں مدرسے سے گھر آ رہا تھا۔ رستے میں دیکھتا کیا ہوں کہ ایک طرف سینکڑوں آدمیوں کی بھیڑ لگی ہے۔ ذرا قریب گیا تو معلوم ہوا کہ لوگ گھیرا باندھے کھڑے ریچھ کا تماشا دیکھ رہے ہیں۔ میں نے سوچا۔ لاؤ میں بھی ذرا ٹھیر کر یہ تماشا دیکھ لوں۔ بڑی مشکل سے لوگوں کو چیرتا ہوا اندر گھیرے میں ایسی جگہ پہنچا جہاں کھڑے ہو کر ریچھ کا تماشا بہت اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ لوگوں نے کہا ایسی گھبراہٹ کیا ہے تماشا ابھی شروع ہوا ہے۔

ریچھ والا بائیں ہاتھ میں ایک ڈنڈا اور ریچھ کی رسی پکڑے تھا۔ دائیں ہاتھ سے ڈگڈگی بجا رہا تھا۔ اور سُریلی آواز میں یہ گیت گاتا جاتا تھا۔

بٹیا اپنا ناچ دکھا دے
ناچ دکھا دے ناچ دکھا دے
بٹیا اپنا ناچ دکھا دے
ناچ ذرا دل کھول کے بٹیا   سب کو دکھا دے آج کہروا

بٹیا اپنا ناچ دکھا دے

بچے کھڑے ہیں دانت نکالے گردن اور کوھلے مٹکالے

بٹیا اپنا ناچ دکھادے



کاتے چرخا کات لے بھائی اس میں نہیں ہے کوئی برائی

بٹیا اپنا ناچ دکھادے

کشتی لڑلے رستم بن جا زور دکھا کچھ دیر کو تن جا

بیٹا اپنا ناچ دکھا دے

بندگی کرے سر کو جھکا کر مانگ لے پیسا ہاتھ بڑھا کر

بیٹا اپنا ناچ دکھا دے

ناچ چھما چھم چھمک چھیا کود دھما دھم دھمک دھیا

بیٹا اپنا ناچ دکھا دے

بیٹا اپنا ناچ دکھا دے

ریچھ والا جو کچھ کہتا جاتا تھا۔ ریچھ اسی طرح کرتا جاتا تھا۔ میں حیران تھا کہ ریچھ آدمی کی بولی کیسے سمجھ لیتا ہے۔

تھوڑی دیر میں ناچ ختم ہوگیا۔ تو ریچھ والا ریچھ سے کشتی لڑنے کے لئے تیار ہوا۔ دونوں سامنے آئے اور ذرا سی دیر میں ایک دوسرے سے گتھ گئے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ سچ مچ دو پہلوان اکھاڑے میں کھڑے کشتی لڑ رہے ہیں۔ جب کشتی ختم ہوگئی تو لوگوں نے ایک ایک دو دو پیسے ریچھ والے کو دئے۔ وہ سب کو دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔

گھر آیا تو یہ سب حال میں نے اپنی چھوٹی بہن اور چھوٹے بھائی کو سنایا۔ وہ بھی ریچھ کے ناچ کا حال اور چرخا کاتنے اور سلام کرنے کی باتیں سنکر بہت حیران ہوئے۔ اتنے میں ابا جان بھی کچہری سے آگئے۔ میں فوراً ان کے پاس گیا اور سارا حال ان سے کہہ سنایا۔ اور پوچھا یہ ریچھ آدمی کی بولی کیسے سمجھ جاتا ہے۔

انھوں نے کہا۔ بیٹا! ریچھ بولی نہیں سمجھتا، بلکہ رسّی کے اشارے پر کام کرتا ہے۔

میں نے کہا۔ مگر ابا جان! ریچھ یہ سب کچھ اشاروں ہی سے بھی سیکھ کس طرح جاتا ہے

ابا جان نے کہا۔ میاں! پیٹ بُری بلا ہے جب فاقے پر فاقے ہوتے ہیں اور ریچھ والے کے ڈنڈے کا ڈر بھی رہتا ہے تو ریچھ یہ سب کچھ کرنے لگتا ہے۔ ہاں اس سے ایک بات آسانی سے ہم بھی سیکھ سکتے ہیں کہ جب جانور تک کوشش اور محنت سے اتنی باتیں سیکھ جاتے ہیں تو ہم انسان کچھ سیکھنا چاہیں تو کیا کوشش اور محنت سے نہیں سیکھ سکتے۔

ننھے معمار

محمد عزیر صاحب دار المصنفین اعظم گڑھ

اب سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے دنیا میں بہت بڑا سیلاب آیا تھا۔ زمین کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جہاں کے لوگ اپنی جان بچانے کے لئے پریشان نہ ہوں۔ لیکن انھیں سلامتی کی کوئی جگہ نظر نہ آتی تھی۔ اُن کے مکانات سیلاب کی موجوں میں بہہ رہے تھے انھوں نے اپنے بادشاہوں کے اونچے اونچے قلعوں میں پناہ لینی چاہی تھی مگر سیلاب کی موجیں اتنی تیز تھیں کہ قلعوں کی دیواریں بھی ہلنے لگیں۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں تمام قلعے گرنے لگے۔ اب ہر طرف تباہی کا سامنا تھا۔

اُسی زمانے میں عرب کے ملک میں ایک بڑا رحم دل بادشاہ تخت پر بیٹھا تھا۔ عرب میں بھی سیلاب کا زور شور ویسا ہی تھا جیسا دنیا کے اور حصوں میں۔ بلکہ وہاں کی حالت ہر جگہ سے زیادہ خراب تھی۔ اس بادشاہ نے رعایا کی جان و مال بچانے کے لئے فوراً ایک بہت بڑا اور نہایت مضبوط قلعہ بنوایا۔ یہ قلعہ اتنا بڑا تھا کہ عرب ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کے آدمی جو سیلاب کی وجہ سے برباد ہو رہے تھے اس میں پناہ لے سکتے تھے جب یہ قلعہ بن کر تیار ہوا۔ اور اس کی شہرت پھیلی تو دنیا کے ہر حصے کے لوگ آکر اس میں پناہ لینے لگے، افریقہ، چین، ایران، توران، یورپ، ہندوستان، شام افغانستان، جاوا، سماترا غرض ہر ملک کے لوگ آکر اس قلعے میں آباد ہوئے۔ اور سیلاب کے

خطرے سے محفوظ ہوکر اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگے۔

اس درمیان میں بادشاہ کا انتقال ہوگیا تھا۔ لیکن قلعے کی آبادی بڑھتی ہی گئی۔ کچھ ہی دنوں میں سیلاب کا زور بھی بہت گھٹ گیا اور ہر طرف خوش حالی نظر آنے لگی۔ قلعے کی مضبوطی کا امتحان اس وقت ہوچکا تھا جب سیلاب پورے زور پر تھا۔ اس لئے اس کے باشندے اب بالکل بے فکر ہوگئے۔ لیکن چند روز ایک جگہ مل کر رہنے کے بعد انھوں نے آپس میں لڑنا جھگڑنا شروع کردیا۔ اور ایک حصے کے لوگ دوسرے حصے کے لوگوں پر حملہ کرکے اُن کو برباد کرنے کی کوشش کرنے لگے ان حملوں میں قلعہ کی عمارت کو بھی نقصان پہنچنے لگا۔ لڑنے والوں نے اپنی دشمنی کے جوش میں یہ خیال نہیں کیا کہ اگر قلعے کے کسی حصے کو نقصان پہنچا تو اس کا اثر دوسرے حصوں پر بھی پڑے گا۔ کیوں کہ اگر سیلاب پھر کبھی آیا تو کم زور حصوں سے اندر داخل ہوکر قلعہ کی پوری آبادی کو تباہ کردے گا۔

کئی سو برس اسی حال میں گذر گئے۔ اور لوگوں کی آپس کی لڑائی جاری رہی۔ آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ دنیا میں ایک زبردست سیلاب پھر آیا۔ چھوٹی بڑی عمارتیں پھر گرنے لگیں، لوگ پریشان ہوکر ہر طرف دوڑنے لگے پچھلے سیلاب کے زمانے میں اس قلعے کی مضبوطی کا فیصلہ ہوچکا تھا۔ اب کی بار لوگ پھر اسی کی طرف دوڑے۔ لیکن اس کی دیواروں کے بہت سے حصے آپس کی جنگ میں کم زور ہوچکے تھے۔ اور اب سیلاب کا پانی آہستہ آہستہ اندر داخل ہو رہا تھا۔ سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ جو لوگ اس قلعے میں رہتے تھے انھیں اب تک اپنے خطرے کا اندازہ نہ تھا اور وہ بے فکری کے ساتھ اپنی لڑائیوں میں مصروف تھے۔ دور دور کے ملکوں سے لوگ سیلاب سے بھاگ کر آتے اور اس قلعے میں پناہ لینی چاہتے، مگر ان کو قلعے کی کم زوری اور اس کے باشندوں کی بے فکری دیکھ کر بڑی حیرت اور نا امیدی ہوتی۔ اُن کی سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کریں کیا نہ کریں جس

قلعے کی مضبوطی کا شہرہ سن کر وہ اپنے ملکوں سے آئے تھے وہ اتنا کم زور ہو چکا تھا کہ زیادہ دنوں تک سیلاب کو روک نہیں سکتا تھا۔

ادھر سیلاب کا پانی قلعے کے اندر داخل ہوتا جاتا تھا اور جو دیواریں آپس کے حملوں سے کم زور ہو گئی تھیں وہ اب ہلنے لگیں۔ کچھ لوگوں نے آہ و فریاد کرنی شروع کی لیکن لڑنے والوں کی گرج اتنی اونچی تھی کہ آہ و فریاد کی آواز کون سنتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لڑنے والوں نے سیلاب سے سازش کر لی ہے۔ اور دونوں مل کر قلعے کو برباد کر ڈالنا چاہتے ہیں۔

اتنے میں قلعے کے اُس حصے سے جہاں ہندوستان کے پایۂ تخت دہلی کے باشندے آباد تھے کچھ بچوں کی آواز سنائی دی۔ معلوم نہیں اس آواز میں کیا بات تھی کہ لڑنے والوں کی گرج اور ڈوبنے والوں کی آہ و فریاد کے شور میں بھی صاف سنائی دیتی تھی۔ ان بچوں نے جامعہ نام کی ایک چھوٹی سی جماعت بنالی تھی۔ اور وہ اپنے ننھے ننھے کاندھوں پر پتھر کے ٹکڑے اُٹھائے ہوئے قلعے کے ایک حصے کی طرف جو سب سے زیادہ کم زور نظر آتا تھا۔ تیزی کے ساتھ دوڑے جا رہے تھے۔ وہ اس کام میں کچھ ایسے لگے ہوئے تھے کہ انھیں کھیل کود کا بھی ہوش نہ تھا اُن کی یہ دُھن دیکھ کر کچھ لوگ مسکرائے کہ بھلا اتنے بڑے قلعے کی مرمت اِن بچوں سے کیا ہو سکے گی۔ کچھ لوگوں نے انھیں روک کر سمجھانے کی بھی کوشش کی کہ ایسے بیکار کام میں وقت خراب نہ کریں۔ مگر بچوں کے قدم ایک منٹ کے لئے بھی نہ رکے اور دیواروں کی جڑیں پتھر کا پشتہ برابر اونچا ہوتا ہو گیا۔

علاقہ غیر کا پٹھان

ہندوستان کے نقشے میں تمھیں پنجاب کے بعد ایک اور صوبے کے نشان نظر آئیں گے۔ یہ سرحد کا صوبہ کہلاتا ہے۔ اور اس کا دارالسلطنت شہر پشاور ہے۔ اس صوبے کی سرحد پر ہندوستان کی حد ختم اور پھر افغانستان کا علاقہ شروع ہوتا ہے۔ لیکن دونوں سرحدوں کے درمیان کچھ تھوڑا سا ٹکڑا ہے جسے علاقہ غیر کہتے ہیں۔ یہاں پٹھانوں کے بہت سے قبیلے آباد ہیں۔ ان قبیلوں پر نہ تو کابل والوں کی حکومت ہے نہ انگریزوں کی۔ ہاں ان دونوں کا اُن پر اثر ضرور ہے۔ خصوصاً انگریز انھیں قابو میں رکھنے کی برابر کوشش کر رہے ہیں اس لئے نہ تو یہ کسی ملک کی رعیت ہیں اور نہ پورے طور پر آزاد کہے جا سکتے ہیں

علاقہ غیر پہاڑی علاقہ ہے جس میں کوہ ہندوکش کوہ سفید اور کوہ سلیمان کی شاخیں بتدریج پھیلی ہوئی ہیں اور کئی تیز بہنے والی ندیاں ان پر سے بہہ کر دریائے سندھ میں جا گرتی ہیں۔ یہی ندیاں اصل میں افغانستان جانے کے راستے ہیں جو "درے" کہلاتے ہیں۔ مشہور درے یہ ہیں:۔

(۱) درہ خیبر (۲) درہ کرم (۳) درہ ٹوچی (۴) درہ گومل۔

یوں تو کافی عرصے سے یہ علاقہ انگریزوں کے اثر میں ہے۔ مگر پچھلے دس بارہ سال میں انگریزی حکومت کا اثر یہاں بہت بڑھ گیا ہے۔ انگریزوں نے سرحد کی حفاظت کے لئے جگہ جگہ بڑی بڑی فوجی چھاؤنیاں قائم کر رکھی ہیں جو پکی سڑکوں سے ملا دی گئی ہیں۔ ان رعایتوں کے عوض سرکار ان قبیلوں کے سرداروں کو جو ملک کہلاتے ہیں مستقل وظیفہ دیتی ہے۔ مگر ان کی آپس کی باتوں میں بہت کم دخل دیا جاتا ہے اور یہ لوگ ایک حد تک آزاد ہیں۔ انھیں بندوق خنجر وغیرہ ہتھیار رکھنے کی بھی کوئی ممانعت نہیں۔ بعض بعض ملکوں کے پاس توپیں ہیں۔ مشین گنیں اور دیسی و انگریزی ساخت کے بم بھی موجود ہیں۔ بندوقیں اور ہتھیار بنانے کے اکثر ماہر کاریگر اس علاقے میں پائے جاتے ہیں۔ یہ لوگ بہت جوشیلے اور بہادر ہیں۔ معمولی معمولی باتوں پر آپس میں جھگڑتے رہتے ہیں۔ نوبت قتل و خون تک پہنچ جاتی ہے مگر سڑک شاہی اور چھاؤنیوں کی حد میں کوئی واردات نہیں ہونے پاتی۔ ہر قبیلہ اپنے اپنے علاقے میں سڑک کے امن کا ذمے دار ہوتا ہے۔ قبیلے کے چند لوگوں کو انگریزوں کی طرف سے سڑک کا چوکیدار مقرر کیا جاتا ہے۔ تنخواہ بھی دی جاتی ہے۔ انھیں خاصہ دار کہتے ہیں۔ سڑک پر کوئی واردات ہو جائے تو وہ قوم یا تو مجرم کو سرکار کے حوالے کرتی ہے اور اس کا سرحدی قانون کے

مطابق چالان کیا جاتا ہے یا پھر ساری قوم سرکار کو ناغہ ادا کرتی ہے۔

ملکی انتظام کے طور پر یہ علاقہ چار حصوں میں تقسیم ہے انھیں ایجنسی کہتے ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں:۔ (۱) خیبر ایجنسی یا آفریدی قوم کا علاقہ، صدر مقام لنڈی کوتل یہ ریل کے ذریعے ہندوستان سے ملا ہوا ہے۔ (۲) کرم ایجنسی یا کزئی قوم کا علاقہ اس کا صدر مقام پارہ چنار ہے۔ یہ جگہ صحت کے لئے مفید اور میووں کی پیداوار کے لئے مشہور ہے (۳) شمالی وزیرستان جو وزیریوں کا ملک ہے۔ صدر مقام میران شاہ ہے (۴) جنوبی وزیرستان۔ جس میں "محسود" یا "مسعود" قوم آباد ہے۔ صدر مقام وانا ہے۔ ہر ایجنسی میں انگریزوں کی طرف سے ایک پولیٹکل ایجنٹ رہتا ہے جو انگریزی حکومت کے حقوق کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ اور قبیلوں کے ساتھ معاملات طے کرتا ہے اس کی مدد کے لئے ایک مقامی فوج ہوتی ہے جو اس علاقے سے اچھی طرح واقف ہونے کی وجہ سے اسکاؤٹس (Scouts) کہلاتی ہے۔ مثلاً خیبر اسکاؤٹس۔

یہ ایک خشک پہاڑی علاقہ ہے۔ بعض چوٹیاں بہت اونچی ہیں۔ مثلاً کوہ سفید کا سلسلہ۔ یہ سال بھر تک برف سے ڈھکا رہتا ہے مگر اکثر پہاڑ نیچے نیچے اور خشک ہیں بعض پر تو گھاس اور جھاڑیوں کے سوا کچھ پیدا نہیں ہوتا۔ کہیں کہیں عمارتی لکڑی کے جنگل پائے جاتے ہیں۔ اس لئے یہ لوگ بھیڑیں پالتے ہیں۔ یا عمارتی یا جلانے کی لکڑی سرحد کے شہروں میں بیچ کر گذر کرتے ہیں۔ یہاں ایک قسم کا پودا ہوتا ہے جسے خزری کہتے ہیں۔ اس کا قد دو تین فٹ سے زیادہ نہیں ہوتا۔ پتے کھجور کے پتوں سے مشابہ ہوتے ہیں اور پتوں سے پلنگ کے بان اور چٹائیاں بُنی جاتی ہیں۔ یہ لوگ کسی قسم کی صنعت و حرفت نہیں جانتے۔ البتہ کہیں کہیں ہتھیار بنانے والے کاری گر پائے جاتے ہیں۔

دریا کے کنارے جہاں کہیں زمین ہموار ہوتی ہے تھوڑی بہت کھیتی باڑی کی جاتی ہے۔ گیہوں، جو، مکئی وغیرہ کی کاشت ہوتی ہے۔ پہاڑیوں کی ڈھلانوں پر سیڑھیوں کی طرح چھوٹے چھوٹے کھیت بنا کر کاشت کی جاتی ہے۔ مگر یہ لوگ ہل بہت کم استعمال کرتے ہیں۔ بیلچے کی قسم کا ایک اوزار ہوتا ہے۔ جسے یہ "ہم" کہتے ہیں۔ پانچ، چھ فٹ لمبے ڈنڈے کے سرے پر بالشت بھر لوہے کا نکیلا سا پھل لگا ہوتا ہے۔ ہاتھوں کے زور اور پاؤں کے دباؤ سے اس سے زمین کھودنے کا کام لیا جاتا ہے۔ بعض بعض جگہ میوہ خوبانی، سیب، انگور، آلوبالو، آڑو، توت وغیرہ بکثرت ہوتا ہے۔ کرم ایجنسی میں بادام اور اخروٹ بھی پیدا ہوتے ہیں۔

بنجر علاقے اور سرد و خشک آب و ہوا نے ان لوگوں کو خوب محنتی اور جفاکش بنا دیا ہے۔ مفلس ہونے کے سبب معمولی غذا کھاتے ہیں۔ گیہوں یا مکئی کی روٹی۔ چھاچھ دودھ، گڑ، پیاز اور گوشت ان کی خوراک ہے۔ کچھ عرصے سے چائے بھی پینے لگے ہیں اور اب تو اس کے شیدائی بن گئے ہیں۔ حقہ بہت پیتے ہیں۔ چرس، افیون کا نشہ بھی کرتے ہیں۔ مگر شراب کو بہت برا جانتے ہیں۔ غریب ہیں مگر مہمان نواز بہت ہیں۔ مہمان کی خوب آؤ بھگت کرتے ہیں۔

ان کے گھر کا سامان بھی معمولی اور مختصر ہوتا ہے بھیڑ کی کھال کے مشکیزے ان کے بڑے کام کی چیز ہے۔ اس



[illegible]

[illegible]



[illegible]

دو سرحدی پٹھان



سرحدی فوج کا ایک دستہ



یہ نشانہ خطا نہیں ہو سکتا



سرحدی پٹھانوں کی عورتیں

میں اناج ، آٹا وغیرہ رکھتے ہیں۔ پانی بھی مشکیزوں میں رہتا ہے۔ چھاچھ بھی ایک عجیب طریقے سے مشکیزوں میں بلوئی جاتی ہے۔ رات کو اس میں دودھ ڈال دیتے ہیں۔ صبح جب دہی تیار ہو جاتا ہے تو مشکیزے کے دونوں سرے ہاتھوں سے پکڑ کر اسے زمین کے ساتھ آگے پیچھے کچھ دیر گھماتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ مکھن نکل آتا ہے۔ شاید یہ مکھن نکالنے کا سب سے پرانا طریقہ ہے جو عربوں سے معلوم کیا تھا۔ بعض برتن مٹی کے ہوتے ہیں اور اب تانبے اور المونیم کے برتن بھی استعمال کرنے لگے ہیں۔ سردیوں میں کمرے کے فرش پر "لغر" (اون کی بنی ہوئی بڑی بڑی دریاں) بچھاتے ہیں۔ بعض لوگ قالین بھی استعمال کرتے ہیں۔

اُن کا لباس بھی بہت معمولی ہوتا ہے۔ سر پر پگڑی گلے میں کرتا ، اس پر دمی نمونے کی واسکٹ۔ پاجامے کی جگہ شلوار پہنتے ہیں۔ پاؤں میں چپل جو "خفری" کی رسی سے بناتے ہیں۔ یہ پہاڑی سفر میں بڑا کام دیتی ہے۔ آج کل موٹر کے ٹائر اور چمڑے کے چپل کا بھی رواج ہو چلا ہے۔ عورتیں تنگ پائیچے کی شلوار اور ٹخنوں تک لمبا کرتا پہنتی ہیں۔ جو کمر تک چُست ہوتا ہے۔ مگر نچلا حصہ بہت کھلا ہوتا ہے۔ سر پر دوپٹہ۔ پردے کے لئے اوپر سے چادر بھی ڈال لیتی ہیں۔ عورتوں کا لباس اکثر سُرخ یا سیاہ رنگ کا ہوتا ہے بچے عموماً ایک کرتے میں رہتے ہیں۔ عورتوں اور بچوں کے لباس پر ریشم کا کشیدہ نکالتے ہیں اور افغانی سکے ، موتی منکے اور چھوٹے چھوٹے گھونگھے ٹانکتے ہیں۔ جو بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں عورتیں گلٹ ، چاندی کا زیور۔ مثلاً کانوں کی بڑی بڑی بالیاں ، ہاتھوں کے کڑے۔ اور افغانی سکوں کا گلے میں ہار پہنتی ہیں۔ یہ لوگ نہاتے کم ہیں۔ کپڑے میل کچیل سے گل جاتے ہیں مگر انھیں دھوتے نہیں۔

ملک اور موسم کی سختیوں نے انھیں سخت جان بنا دیا ہے۔ مصیبت اور تکلیف سے نہیں گھبراتے۔ سفر کی تھکن اُن کے نزدیک بے معنی چیز ہے۔ بیس سال پہلے جب سرحد پر پورا پورا امن نہیں تھا۔ یہ لوگ راتوں رات بڑی بڑی منزلیں طے کر کے میدانی علاقوں پر چھاپے مارتے اور لوگوں کا مال و اسباب لوٹ کر بغیر دم لئے پہاڑوں میں واپس پہنچ جاتے۔ مگر انگریزوں کی طرف سے وظیفوں اور سڑکوں اور چھاؤنیوں کے ٹھیکوں کی آمدنی سے یہ لوگ پہلے کی نسبت بہت خوش حال ہو گئے ہیں۔ اب اپنے میدانی پڑوسیوں کو نہیں ستاتے۔

ان کے علاقے میں نہ تو کوئی باقاعدہ حکومت ہے اور نہ کوئی باقاعدہ انتظام ہے۔ اس لئے ہر روز ان کی آپس میں لڑائیاں رہتی ہیں ہر شخص اپنی حفاظت کے لئے بندوق اور خنجر رکھتا ہے۔ بچے اور عورتیں بھی اُن کا استعمال جانتے ہیں۔ اور سب اعلیٰ درجے کے نشانہ باز ہیں۔ بہادری اور دلیری میں بھی بے مثل۔ شروع شروع میں انگریزوں کے ساتھ سالہا سال تک لڑائیاں لڑ چکے ہیں۔

بچاؤ کی خاطر ہر گھر کے گرداگرد ایک فصیل سی ہوتی ہے اور درمیان میں ایک بُرج ہوتا ہے اس پر سے یہ حملہ کرنے والے دشمن پر گولیاں برساتے ہیں۔ پشتو میں اس بُرج کو "مونڑی" کہتے ہیں۔ یہ لوگ کینہ ور بہت ہوتے ہیں۔ کئی کئی پشتوں تک بدلہ یا انتقام میں ایک دوسرے کے آدمی قتل کرتے رہتے ہیں۔ اس کشت و خون کی وجہ

سے نسل کی بربادی لازمی ہے۔ اس لئے ہر شخص دو چار شادیاں ضرور کرتا ہے۔ تاکہ بچے بہت پیدا ہوں۔ عورتوں کو اندر باہر بہت کام کرنا پڑتا ہے۔ مال اور مویشی کا انتظام بھی عورت ہی کرتی ہے۔ جنگل سے جلانے کے لئے لکڑیاں لاتی ہے، پھر بھی کھانا ہمیشہ خاوند اور بچے پہلے کھاتے ہیں اور وہ اُن کے بچے ہوئے ٹکڑوں پر اپنا پیٹ پالتی ہے۔

یہ لوگ روزہ نماز کے بہت پابند ہوتے ہیں اکثر ڈاڑھی رکھتے ہیں۔ ملاؤں اور پیروں کی بہت عزت کرتے ہیں مگر شریعت کی پیروی بہت کم کرتے ہیں۔ آپس کے جھگڑے "جرگہ" یا پنچایت کے سپرد کئے جاتے ہیں جو رواج کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں۔ شادی بیاہ اور موت کی رسموں پر بہت خرچ کرتے ہیں۔ ہر دو موقعوں پر برادری کو کئی کئی روز کھانا کھلایا جاتا ہے۔ بھیڑ کے شوربے میں روٹی گوندھ لیتے ہیں اور اس پر گرم گرم گھی یا چربی ڈال کر کھاتے ہیں۔ گوشت کا حصہ علیحدہ علیحدہ ہر شخص کو دیا جاتا ہے۔ لکھنے پڑھنے سے عاری ہیں۔ اب انگریزوں نے جگہ جگہ مدرسے بنا دئے ہیں جہاں تعلیم مفت دی جاتی ہے۔ بلکہ کتابیں بھی انگریزی حکومت ہی دیتی ہے۔ علاج معالجے کے پرانے طریقے پسند کرتے ہیں۔ نمونیہ کے مریض کی چھاتی پر جلتے گھی کا داغ دیتے ہیں بخار ہو جائے تو دنبے کی تازہ کھال اتار کر مریض کو اس میں لپیٹ دیتے ہیں جس سے اُسے پسینہ آ جاتا ہے اور وہ تندرست ہو جاتا ہے۔ زخموں کی مرہم پٹی کی بہت کم پروا کرتے ہیں انگریزوں نے اب ہسپتال بنا دئے ہیں جن میں ہر سال سینکڑوں کی تعداد میں زخمیوں کا علاج ہوتا ہے۔ یہ لوگ دوکان داری کو بہت برا جانتے ہیں۔ اس لئے اُن کے ہاں تجارت کا کاروبار ہندو ہی کرتے ہیں۔ گاؤں میں ہندو گاؤں کے ملک کا ہمسایہ ہو کر رہتا ہے۔ ملک اس کی عزت اور جان و مال کا محافظ ہوتا ہے۔ کیا مجال کہ کوئی ہندو کا بال بیکا کر سکے۔ ملک اپنے ہندو ہمسایہ کے معاملے میں مسلمان بھائی کا خون کرنے میں دریغ نہیں کرتا۔

مردوں میں ناچ نشانہ بازی۔ نیزہ بازی، دل بہلانے کے بڑے بڑے مشغلے ہیں۔ گانے کا بھی انھیں بہت شوق ہے۔ گانے بجانے میں ڈھول اور ایک سارنگی کی قسم کا مقامی ساز استعمال کرتے ہیں۔ رباب بجانے میں بھی ماہر ہیں۔ اُن کا ناچ عجیب قسم کا ہوتا ہے۔ ڈھول بجانے والے کے آگے بازو پھیلا کر باری باری گھومتے ہیں اور چکر کھاتے وقت ہاتھوں اور سر کو ایک ساتھ جنبش دیتے ہیں۔ اِن لوگوں میں انڈے لڑانے کا ایک عجیب کھیل ہے۔ یہ صرف عید کے موقع پر کھیلتے ہیں۔ اول انڈوں کو ابال لیتے ہیں۔ پھر پانی میں رنگ ڈالتے ہیں۔ جو انڈے کے چھلکے پر چڑھ جاتا ہے اس قسم کے رنگے ہوئے انڈے بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں ایک آدمی اپنا انڈا مٹھی میں پکڑتا ہے اور دوسرا اس کی نوک پر اپنا انڈا مارتا ہے۔ جس کا انڈا ٹوٹ گیا وہ ہار جاتا ہے۔ اور اپنا انڈا فاتح کو دے دیتا ہے مگر لڑانے سے پہلے ایک دوسرے کے انڈے بہت دیر تک جانچتے ہیں۔ کبھی اسے دانتوں پر مارتے ہیں کبھی اسے کان کے پاس ہلاتے ہیں۔ کبھی ماتھے پر مارتے ہیں اس جانچ پڑتال میں اتنی دیر لگاتے ہیں کہ ایک اجنبی تماشہ دیکھنے والا اکتا جاتا ہے







ایران سرحدی قافله



درهٔ خیبر

شیخ نیازی

از جناب رشید صدیقی صاحب پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

پیام تعلیم کے پچھلے تاسیس نمبر میں شیخ نیازی کی عمر جتنی تھی اُس میں ایک سال کا اور اضافہ ہو گیا ہے۔ اسی اعتبار سے اُن کی عقل اور لمبائی چوڑائی بھی بڑھ گئی ہے۔ آواز بھی ذرا پاٹ دار ہو گئی ہے البتہ ابھی یہ اتنا لکھ پڑھ نہیں پائے ہیں کہ پیام تعلیم میں ان کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا تھا اسے یہ خود پڑھ سکیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میں نے جو کچھ ان کے بارے میں لکھا تھا اس کو ان کے بھائی بہن کچھ ایسے رنگ میں پیش کرتے ہیں کہ یہ فوراً فوجداری پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور بچو تمھیں اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا کہ شیخ صاحب جامہ سے باہر ہوتے ہیں تو کیا رنگ لاتے ہیں۔

اول تو تم کو خود معلوم ہے میں نے کوئی ایسی بات نہیں لکھی تھی جس پر یہ ناراض ہوں دوسرے یہ کہ جو کچھ لکھا گیا تھا اس کی بابت یہ خود اقرار کر چکے ہیں کہ اس میں کوئی نامعقول بات نہ تھی۔ لیکن اُن کی چھوٹی بہن عذرا نے مجھے بتایا کہ شیخ نیازی نہایت رازدارانہ طور پر ایک دن کہتے تھے کہ آبا میاں نے باتیں تو سب ٹھیک لکھی تھیں صرف وہ گھُٹل والی بات ذرا خراب تھی!

شیخ صاحب کو گھر کے لوگ کبھی کبھی یوں بھی چھیڑ دیا کرتے ہیں۔ اس وقت یہ ایک نعرہ لگاتے ہیں جس سے سارے محلہ میں خبر ہو جاتی ہے کہ شیخ صاحب نے بے تکلفی کا اعلان کر دیا ہے۔ ایسی حالت میں کوئی شخص قریب نہیں جا سکتا۔ کچھ تو اس سبب سے کہ ان کے نعرے میں وہ خاصیت ہے جو اکس ریز کی

شعاعیں ہیں ہے یعنی ہر چیز کو پار کر جاتی ہے۔ اس لئے لوگ ان کے نعرے کی سیدھ میں نہیں آتے۔ دوسرے یہ کہ اگر اپنے جلال کے دوران میں یہ کسی کو پکڑ لیں تو پھر اسے اِنّا للہ بنا دینے میں کوئی تامل نہیں کرتے۔ ایک دن میں نے بھی جھنجھلا کر کہہ دیا تھا اور تم یقین مانو اس سے ان کی توہین نہیں بلکہ اپنی جھنجھلاہٹ دور کرنی مقصود تھی کہ پکڑ لاؤ اس گوریلے کو۔ بات ختم ہوگئی تھی لیکن اس خطاب پر لوگوں نے چپکے چپکے ہنسنا شروع کر دیا تھا۔ اس پر شیخ صاحب کے کان کھڑے ہوئے اور تم جانتے ہو جب کان کھڑے ہوں تو معمولی سے معمولی بات بھی کان میں داخل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ گوریلے کے متعلق جو چہ میگوئیاں لوگوں نے کیں وہ شیخ صاحب کے کانوں تک پہنچیں۔ شیخ صاحب میرے پاس آئے اور نہایت غصہ ناک لہجہ اور تیور سے بولے، دیکھئے سب لوگ مجھے گوریلا کہتے ہیں۔ پہلے تو میں خود گھبرایا لیکن مجھے شیخ صاحب کی کمزوریاں معلوم تھیں، میں نے کہا آؤ بیٹھ جاؤ، سب لوگ احمق ہیں۔ آخر تمھیں یہ بھی معلوم ہوا کہ گوریلا کہتے کس کو ہیں، انھوں نے کہا کہ اقبال و احسان کہتے ہیں کہ گوریلا افریقہ کا ڈراؤنا بندر ہوتا ہے اور پیام تعلیم میں اس کی تصویر بھی دکھاتے تھے۔ میں نے کہا ان کو کیا معلوم گوریلا کسے کہتے ہیں، گوریلا کے معنی ہیں غوریلا انھوں نے پوچھا غوریلا کیا میں نے کہا غور کرنے والا، کہنے لگے (اور آواز میں غور اور غرّاہٹ دونوں شامل تھی) تو غور کرنے سے کیا ہوتا ہے میں نے کہا غور کرنے کے بڑے فائدے ہیں۔ ایک تو یہی دیکھو غوریلا بہت اچھے اچھے پھل کھاتا ہے، پوچھا کون کون سے پھل، میں نے کہا یہی امرود، آڑو، بھٹے۔ اچھا تمھیں بتاؤ تم کو کون سے پھل پسند ہیں کہنے لگے امرود۔ میں نے جیب سے اکنّی نکالی اور ان کے حوالے کرکے کہا ابکے خوانچہ والا آئے تو امرود خرید لینا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے قہقہہ لگا کر ایک چھلانگ ماری اور میری جان بچ گئی!

شیخ نیازی اب اسکول جانے لگے ہیں۔ بڑی پابندی سے جاتے ہیں اور نہایت تندہی سے واپس آتے ہیں۔ پھندنے کی ٹوپی اور بغیر فیتے کا جوتا پہن کر جاتے ہیں۔ جو کتاب یا کاپی سامنے مل جائے اسے اخلاقاً ساتھ لے جاتے ہیں۔ واپسی میں سیدھے وہاں پہنچتے ہیں جہاں سے کھانا تقسیم ہوتا ہے۔ سب سے اچھی پلیٹ چنتے ہیں اور سب سے زیادہ کھانا لینا چاہتے ہیں اور کوئی مزاحمت کرے تو اس طرح غرّاتے ہیں کہ ہاتھ سے پیالے کفگیر چھوٹ پڑیں۔

ایک دن اسکول سے نہایت جوش و خروش میں واپس آئے جس میں ایک قسم کی تمکنت اور خود اعتمادی بھی پائی جاتی تھی۔ آتے کے ساتھ ہی بولے عذرا کہاں ہیں۔ عذرا اسکول سے آکر منہ

ہاتھ دھو رہی تھیں، بولیں کہو کیا ہے، بولے فوراً آؤ، عذرا بیچاری دوڑی ہوئی آئیں تو بولے، عذرا آج بڑی عجیب بات ہوئی، کھانے پر چلو تو تم کو بتاؤں۔ سب لوگ کھانے پر جمع ہوئے تو دیکھا کہ شیخ صاحب آج غیر معمولی طور پر نہایت فاتحانہ انداز سے کھانے پر ہاتھ مار رہے ہیں اور کوئی روکتا ٹوکتا ہے تو ایسا گھور کر دیکھتے ہیں گویا اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کھا جائیں گے، عذرا بولیں بھئی آج کیا عجیب بات ہوئی ہے، بولتے تو ہو نہیں اور کھانا کھائے جاتے ہو، بولے آٹھ ہزار، عذرا نے پوچھا آٹھ ہزار کیا۔ کہنے لگے ارے تم کیا جانو "آٹھ ہزار۔ اُف" اور یہ کہہ کر خشکہ کی پوری پلیٹ اٹھالی۔ میں نے کہا بھائی آٹھ ہزار سے آگے بھی تو بڑھو ورنہ کھانا ختم کردو، عذرا بولیں، ارے نیازی تم میری پلیٹ میں شامل ہو جاؤ، اور ہاں بتاؤ تو کیا ہوا، شیخ صاحب نے ایک دفعہ پھر للکارا آٹھ ہزار اور ہزار کے ز کو اس طور پر کھینچا کہ معلوم ہوتا تھا دسترخوان کی ساری پلیٹیں کھڑکھڑانے لگیں گی، پھر بولے، عذرا تم کو کیا معلوم آج میڈم نے آٹھ ہزار کا جوڑ لگانے کو دیا تھا۔ سب لوگ دم بخود ہو گئے، اور شیخ صاحب سب کو متحیر چھوڑ کر قریب ہی چارپائی پر لیٹ گئے اور پکارا شفیعا پانی پلا! کھانا ختم ہونے پر ان کے بھائی بہنوں نے مجھ سے کہا ابا میاں نیازی کا حساب بڑا اچھا ہے، ان کا امتحان لیجئے میں نے کہا اچھا بابا۔ شیخ صاحب آئے لیکن تیور سے معلوم ہوتا تھا کہ ابھی آٹھ ہزار کا نشہ اترا نہیں ہے۔ میں نے کہا شیخ جی تمھارے حساب جاننے کا سب پر بڑا رعب ہے، ایک آدھ سوال میں بھی کروں۔ کڑک کر بولے ہاں ہاں۔ میں نے پوچھا تمھاری عمر کیا ہے بولے چھ برس۔ میں نے کہا تمھاری اماں بی کی عمر کیا ہے (ماں سے پوچھ کر) بولے اٹھائیس برس۔ میں نے پوچھا اچھا بتاؤ جب تم پیدا ہوئے تھے تو تمھاری اماں بی کی عمر کیا تھی۔ پہلے تو خاموش رہے۔ اس کے بعد ہی آنکھوں میں چمک آگئی، چہرے پر مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ یعنی آنکھ، کان، ناک، دہانہ، ہونٹ، ٹھوڑی، رخسار، رفتہ رفتہ پھولنے بڑھنے لگے، پھر جھومے اور ایک زبردست قہقہہ لگا کر فرمایا۔ اچھا، دھوکا دے رہے ہیں، جب میں پیدا ہوا تھا تو ننھا منا بالکل احمد کے برابر تھا (احمد ان کے سب سے چھوٹے بھائی کا نام ہے جس کی عمر بمشکل ایک ماہ کی تھی) مجھے کیا معلوم اس وقت اماں بی کتنی بڑی تھیں!

حاضرین ہنستے ہنستے لوٹ گئے، لیکن عذرا کو خفت ہوئی انھوں نے اپنے ہیرو کو ایک اور موقع دلانا چاہا اور مجھ سے کہا ابا جان کچھ اور پوچھئے، میں نے کہا اچھی بات ہے۔ میں نے پوچھا مسٹر نیازی یہ تو بتاؤ تمھاری عمر کیا ہے۔ کسی قدر ترش ہوکر

بولے بتا تو چکا چھ برس کا ہوں۔ میں نے کہا اس میں خفا ہونے کی کون سی بات ہے۔ عمر پوچھنے پر تو صرف عورتیں خفا ہوتی ہیں۔ تمہارا کیا بگڑ گیا ہے۔ اچھا بتاؤ عذرا کی عمر کیا ہے؟ کہنے لگے نو سال کی۔ میں نے کہا ٹھیک۔ اب یہ بتاؤ تم بڑے ہو یا عذرا۔ ہنس کر بولے ارے یہ کیا بات ہوئی، عذرا مجھ سے تین سال بڑی ہیں۔ میں نے کہا اچھا کے سال میں تم عذرا سے بڑے ہو جاؤ گے۔ نہایت فخر کے ساتھ برجستہ جواب دیا "چار سال میں"!

اب عذرا سے بھی نہیں رہا گیا بولیں ابا میاں ان کا ایک اور واقعہ بھی آپ نے سنا۔ ایک دن میں نے ان سے کہا نیازی اسکول جاؤ، انھوں نے میرا کہنا گوارا کیا، تھوڑی دیر کے بعد میں نے کہا دیکھو ساڑھے نو بج گئے تم اسکول نہیں گئے پھر بھی انھوں نے نہیں خیال کیا تو میں نے اماں بی سے کہا کہ ساڑھے نو بج گئے ہیں اور نیازی اسکول نہیں جاتے۔ اماں بی نے ڈانٹا تو بگڑ کر بولے ارے اسکول کا وقت نو بجے کا ہے ابھی تو ساڑھے نو بجے ہیں!

شیخ نیازی نماز کے بڑے پابند ہیں۔ خواہ کسی حال میں ہوں نماز پڑھنے سے باز نہیں آتے۔ نماز کے دوران میں بعض لوگوں نے اعتراض کیا، مثلاً نماز کے لئے یہ قبلہ رو ہونا ضروری نہیں سمجھتے تھے، سر پر ٹوپی نہ ہو تو اس کی بھی پروا نہیں، جب جی چاہتا ہاتھ باندھ لیتے اور جب جی چاہتا دونوں ہاتھ کمر پر باندھ لیتے۔ چاہا تو قرات شروع کر دی ورنہ قطعاً خاموش رہتے۔ جتنی دیر جی چاہتا رکوع میں رہتے اور سجدہ میں بھی جب تک جی میں آتا قیام فرماتے۔ الحمدللہ کی صرف چند نامکمل آیات یاد ہیں جن کو جب جی چاہتا خواہ قیام ہو رکوع ہو یا سجود صرف مختلف قرات سے ادا کرتے رہتے۔ لوگوں نے شبہ ظاہر کیا کہ یوں نہیں یوں ہونا چاہئے تو بحث میں پڑ گئے اور بالآخر یہ طے کر لیا کہ نماز ہمیشہ عذرا کے ساتھ پڑھی جائے گی۔ چنانچہ اب یہی کرنے لگے ہیں۔ ایک بار نماز کے دوران میں الحمدللہ کی آیت پڑھتے پڑھتے ریڈیو کا ایک گانا گانے لگے عذرا نے کہنی ماری تو اٹینشن ہو گئے۔

ایک بار سجدے میں تھے وہ بھی اس طور پر کہ صرف [illegible] کو ذرا طوالت دیدی تھی یعنی ہتھیلی اور دونوں تلوؤں کے [illegible] کوئی اور حصہ جانماز سے متصل نہیں تھا۔ ایک نعبد پڑھتے [illegible] تھے اور سر کو گھٹنوں کے قریب تر لاتے جاتے تھے۔ [illegible] ٹانگوں کے درمیان سے اپنی کیاری کے گلاب گنتے [illegible] سے میں گذر رہا تھا، بولے ابا میاں میری کیاری میں [illegible] ہے ذرا نکال دیجئے گا۔ ان کی آواز سے میں یہ سمجھا [illegible] تخت کے نیچے سے بول رہے ہیں۔ اب جو دیکھتا [illegible]

پر اس غبارے کی شکل میں نظر آئے جو اردو ریڈروں میں چھپا ہوا ہے۔ میں نے کہا کیوں بھئی یہ کس قسم کی نماز ہے۔ بولے کیا کروں سب سے پوچھتا ہوں نماز میں منہ پھیر کر سلام کیسے کیا جاتا ہے۔ کوئی بتاتا ہی نہیں۔

ایک دن باہر سے آئے چہرہ تمتمایا ہوا، غصہ اور بے بسی کا یہ عالم تھا جیسے کوئی جوالا مکھی پہاڑ پھوٹ پڑے گا۔ لوگوں نے پوچھا شیخ صاحب کیا حال ہے شیخ صاحب کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن غصہ کا یہ حال تھا کہ نتھنوں اور آنکھوں سے چنگاریاں اڑتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں بولے اب میں نماز نہیں پڑھوں گا۔ عذرا نے سنا تو بدحواس ہوگئیں، کہنے لگیں ارے توبہ کرو توبہ کیا بات ہوئی، پھر کر بولے اقبال نے مجھے گالی دی ہے۔ ایک طرف سے کسی نے آواز دی تو تم نے بھی کیوں نہیں گالی دی۔ یہ سننا تھا کہ چیخ پڑے اور عذرا پر اس طور پر جھپٹے گویا اسے بھنبھوڑ ڈالیں گے۔ عذرا بیچاری ایک طرف دبک گئیں۔ پھر بولے کیسے گالی دوں نماز جو پڑھتا ہوں۔ ان کے اس جواب پر دنیا داروں کی تو بڑی تفریح رہی لیکن عذرا نے ان کا ہاتھ پکڑ کر باہر کا راستہ لیا اور تھوڑی دیر بعد انھیں سمجھا بجھا کر ہنستا ہوا واپس لائیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ عذرا نے انھیں بتا رکھا تھا کہ جو نماز پڑھتا ہے وہ گالی نہیں بکتا ورنہ نماز کا سارا ثواب زائل ہو جاتا ہے۔

اسکول میں میڈم اور ماسٹر صاحب پر شیخ صاحب کا بڑا رعب ہے۔ میڈم جب بھی آتی ہیں تو ان کی بڑی تعریف کرتی ہیں۔ کہتی ہیں کہ نیازی کلاس میں بہت باقاعدہ رہتے ہیں۔ کبھی روتے جھگڑتے نہیں۔ محنت سے جی نہیں چراتے اور دوڑ میں بڑے مستعد رہتے ہیں۔

ایک دن شام کو ان کے کلاس اور اسکول کے کچھ لڑکے ہمارے ہاں آئے شیخ صاحب اپنی کیاری کے پھول سب کو دکھا رہے تھے۔ اور ہنسنے بولنے میں مصروف تھے میں نے لڑکوں سے دریافت کیا کیوں بھئی تم لوگوں میں سے کون کون کلاس میں مار کھاتا ہے اور مار کھانے پر روتا ہے۔ سب نے اقرار کیا کہ مار بھی کھاتے ہیں اور روتے بھی ہیں۔ ایک لڑکے نے کہا نیازی بھی تو مار کھاتے ہیں۔ شیخ صاحب چمک کر بولے لیکن روتا جو نہیں۔ میں نے پوچھا روتے کیوں نہیں بولے جو چلانے پر مار کھاتا ہوں!

ماں نے پوچھا آخر اس کا کیا سبب ہے کہ گھر پر بغیر مار کھائے روتے ہو اور اسکول میں مار کھانے پر بھی چوں نہیں کرتے، لڑکوں کی طرف اشارہ کر کے بولے یہ جو وہاں ہوتے ہیں!۔

مسٹر نیازی فرمائش کرنے میں سب سے آگے رہتے ہیں۔ ایک دن میں شہر جا رہا تھا کہنے لگے میرے لئے ایک فٹ بال لائے گا۔ میں نے کہا اچھا، اب میری خاطر مدارات شروع ہوئی جوتا موزہ لاکر رکھ دیا گیا، ٹوپی ہاتھ میں لئے رہے اور اس کا پھندنا ہاتھ میں لے کر اس طور پر گھمانا شروع کیا کہ میرے ارد گرد ۲-۲ چار چار گز تک مکھیوں کا گذرنا ناممکن ہوگیا اس دوران میں برابر فٹ بال کی صورت شکل، وزن، رنگ، فٹ بال میچ، اپنے کھیل کی تعریف، فٹ بال کے گم ہوجانے کے امکانات یا اس کے محفوظ رکھنے کی تدابیر، اپنے دوستوں کی توصیف، دشمنوں کی مذمت، اماں بی کو دوا نہ پینے پر ملامت، غرض کوئی ایسا مسئلہ نہ تھا جس پر ایک ہی سانس میں یہ اپنے سارے خیالات نہ ظاہر کرتے جا رہے ہوں۔ اتنے میں عذرا میرے قریب آگئیں۔ انھوں نے لپک کر عذرا کو دھکا دیا اور بولے دیکھتی نہیں ابا میاں میرا فٹ بال لینے جا رہے ہیں!

میں تانگے پر سوار ہوا۔ تانگے تک یہ بھی ساتھ آئے اور برابر فٹ بال کے مسئلے پر گفتگو کرتے رہے۔ میں کچھ دور نکل گیا۔ انھوں نے ایک نعرہ لگایا اور دوڑ پڑے میں نے تانگہ رکوایا، نہایت رازدارانہ لہجے میں بولے، دیکھئے فٹ بال کا فیتہ بھی لائے گا۔ کچھ دور آگے بڑھا، اتنے میں انھوں نے ایک بار پھر پکارا، ابا میاں جلد جلد جائے بڑے زور کی بارش آرہی ہے۔ غرض یہ شہر پہنچا اور رات گئے واپس آیا۔ دیکھا تو باہر کے بیرونی دروازے پر اندھیرے میں کھڑے ہیں، تانگا دیکھتے ہی نعرہ لگایا "ابا میاں فٹ بال" میں نے بھرا ہوا فٹ بال ان کے حوالے کیا اور فٹ بال پاتے ہی ان کے چہرے پر جو خوشی کی جگمگاتی ہوئی لہریں دوڑی ہیں اور شیخ صاحب نے مسرت اور شادمانی کی جیسی کچھ صدائیں بلند کی ہیں ان سے مجھے کچھ ایسا معلوم ہونے لگا گویا ساری دنیا صرف ایک فٹ بال ہے جس کی ہر حرکت اور آواز صرف شیخ نیازی کی حرکت اور آواز ہے!

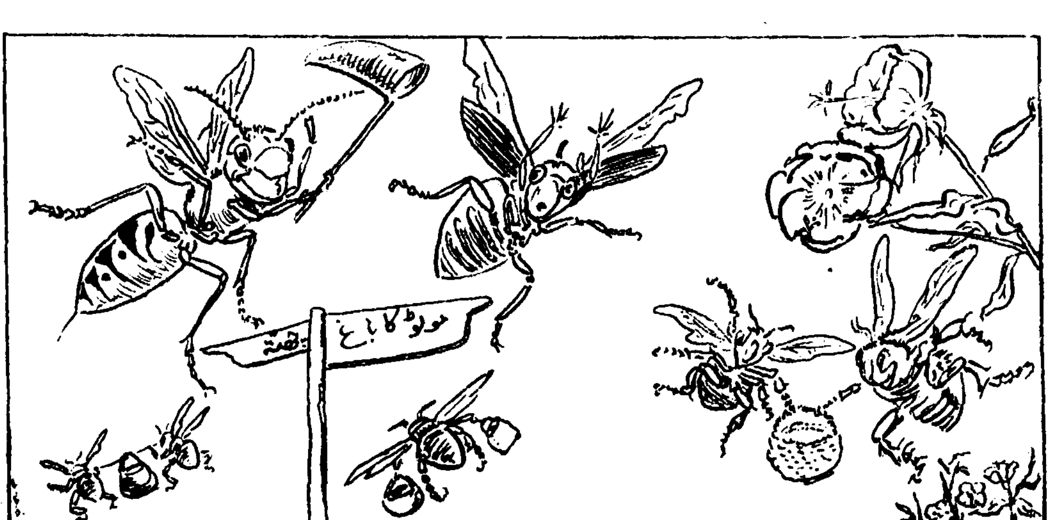
بچو، یہ آخری بات میں نے کچھ یونہی سی کہدی ہے اس کو تم ابھی نہیں سمجھو گے۔ اس کا لطف تم کو اس وقت آئے گا جب تم خود بچے سے باپ بنو گے پھر تم کو معلوم ہوگا کہ تحفہ ملنے پر بچہ کی خوشی سے ماں باپ کو کیسی خوشی ہوتی ہے۔ اس کا معمولی سا تجربہ تم کو یوں بھی حاصل ہو سکتا ہے کہ تعطیل میں اپنے گھروں کو جاؤ تو اپنے چھوٹے چھوٹے بھائی بہنوں کے لئے کوئی تحفہ لے جاؤ۔ پھر دیکھو وہ کیسے خوش ہوتے ہیں اور ان کی خوشی سے تمھارے دل میں خوشی اور فتحمندی کی کیسی لہریں

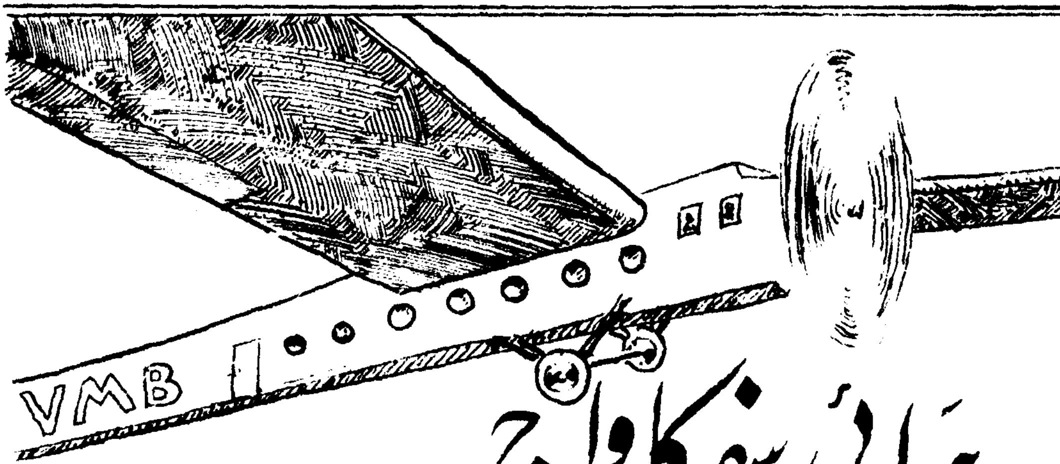
اٹھتی ہیں۔ مجھے ٹھیک یاد نہیں، بہت دن ہوئے میں نے اپنے بزرگوں کو ایک بار یہ بات کرتے سُنا تھا کہ ہمارے تمھارے نبی کریم نے (خدا ان کی یاد کو ہمارے لئے بہترین یاد بنائے) فرمایا کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ ایک دوسرے کو تحفے تحائف لیا دیا کریں۔ اس سے محبت بڑھتی ہے۔

بچو، معاف کرنا مضمون لکھنے میں میری عادت بیچ بیچ میں بہک جانے کی ہے۔ میرے دل میں جو کچھ آتا ہے اسے لکھتا جاتا ہوں یہی نہیں بلکہ لکھنا چھوڑ کر جھاڑو دینے لگتا ہوں خوانچہ والوں سے دام چکانا شروع کر دیتا ہوں، کپڑا دھونے لگتا ہوں، کسی بچے سے کھیلنے لگتا ہوں یا اسے ڈانٹنے لگتا ہوں یا لیٹ کر گانے لگتا ہوں یہاں تک کہ گھر کے سب لوگ اپنا اپنا کام کاج چھوڑ کر ہنسنا شروع کر دیتے ہیں یا مجھے دھمکانے لگتے ہیں اور میں تمھارے لئے پھر مضمون لکھنے لگتا ہوں یعنی ختم کر دیتا ہوں۔

نیازیو، شیخ نیازی کی داستان ختم نہیں ہو سکتی اب یہ سیانے ہو رہے ہیں اور پسند نہیں کرتے کہ میں ان پر مضمون لکھوں لیکن تم کو معلوم نہیں مضمون لکھنے کی عادت بڑی خراب ہوتی ہے اور میں بوڑھا ہو رہا ہوں۔ تمھارے شیخ الجامعہ صاحب نے سچ کہا ہے کہ بُری عادتیں بڑھاپے میں جوان ہو جاتی ہیں۔ اس لئے میری عادت تو ترک نہیں ہو سکتی میں صرف یہ البتہ کر سکتا ہوں کہ آئندہ سال شیخ نیازی کو جامعہ میں داخل کرا دوں وہیں وہ تم سے تم ان سے اور تم دونوں اڈیٹر صاحب پیام تعلیم سے نپٹ لینا۔

خدا حافظ،





ہوائی سفر کا رواج

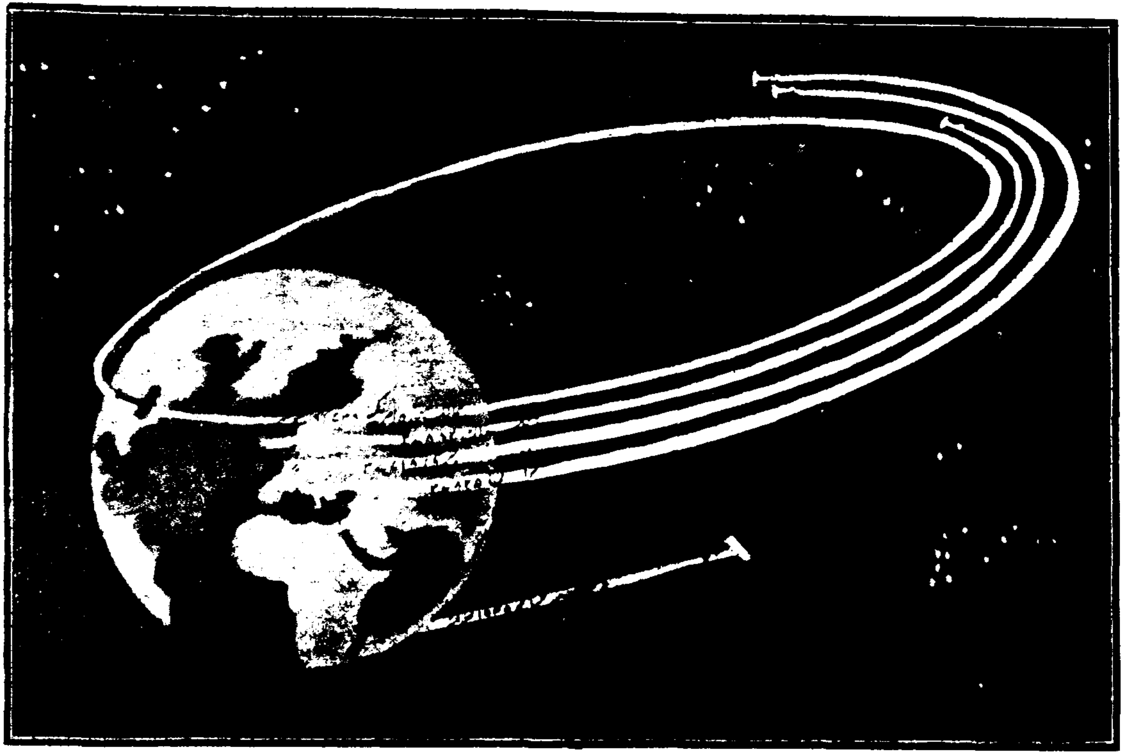
امتیاز صاحب

آدمی کا بھی کیا کہنا جس چیز کی دُھن لگ جائے بس اُسی کے پیچھے پڑ جاتا ہے، اور اُسے کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے۔ ہوا میں اُڑنے کی سوجھی تو اُسی کو کمال تک پہنچا دیا۔ ابھی ۱۹۰۰ء میں اس کے پاس ہوائی جہازوں کا نام نہ تھا۔ اور آج ان میں اُڑتا پھرتا ہے۔ تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ آدمی ان ہوائی جہازوں میں کتنا سفر کرتے ہونگے۔ اچھا ذرا دل میں خیال تو کرلو اور پھر نیچے کی تصویروں کو دیکھو تو حیران رہجاؤ گے۔

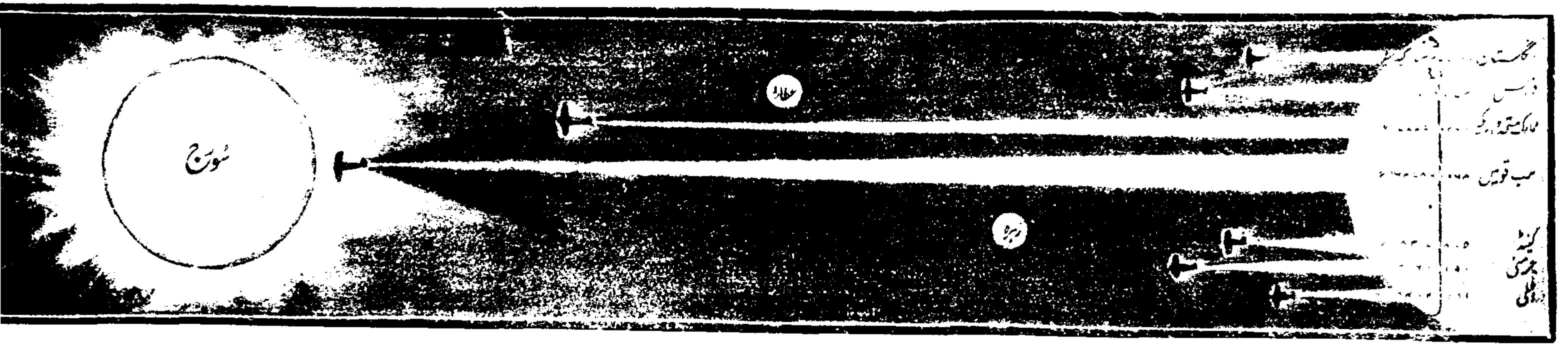
پہلی تصویر میں یہ دکھایا ہے کہ اگر دنیا اتنی بڑی ہو جتنی تصویر میں ہے تو بعض ملکوں کے ہوائی اسٹیشنوں کے درمیان کا فاصلہ ۱۹۳۴ء میں وہ تھا جو تصویر کے حلقوں سے ظاہر کیا گیا ہے۔

دیکھو امریکہ کے ہوائی جہازوں نے تو ۳۴ء میں کوئی ۸۱۷۳۸ کلومیٹر طے کئے۔ کچھ سمجھے، یہ زمین کے خطِ استوا سے دوگنی لمبائی ہوئی! (کلومیٹر ہزار میٹر کو کہتے ہیں، اور میٹر کوئی ۳ ۱/۴ فٹ کا ہوتا ہے) امریکہ کے بعد فرانس کا نمبر ہے۔ اس کے بعد جرمنی کا۔ پھر انگلستان اور آسٹریلیا کا۔

اسی مطلب کو اس دوسری تصویر میں بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ دیکھو، ایک طرف زمین ہے



تصویر (۱) اس کی تشریح مضمون (ہوائی سفر کا رواج) میں دیکھو

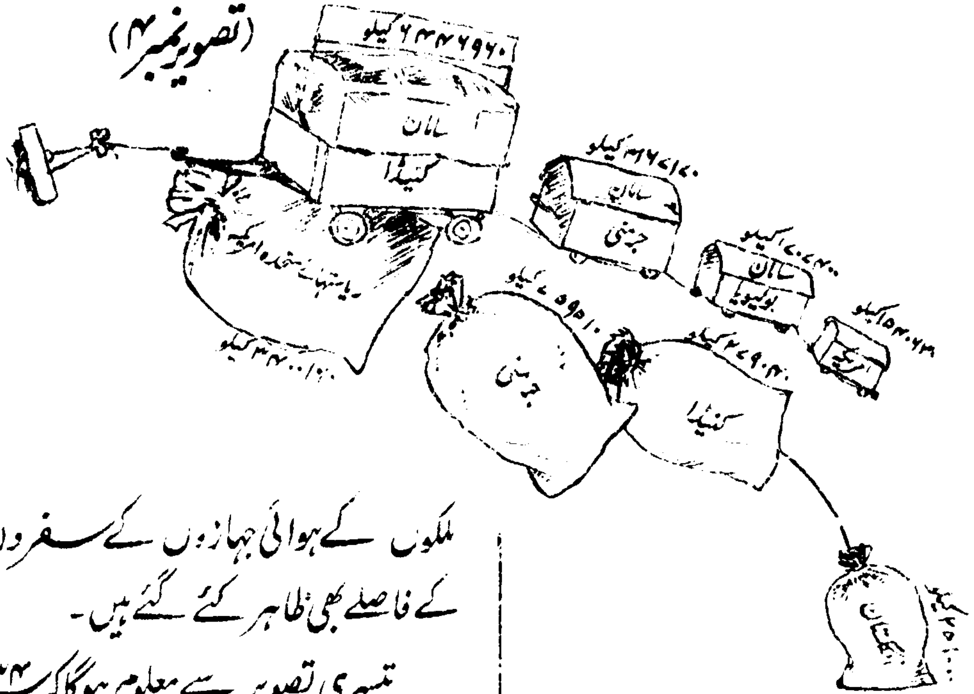


تصویر (۲)



(تصویر نمبر ۱۳۳۳۰۰۰

(تصویر نمبر ۴)

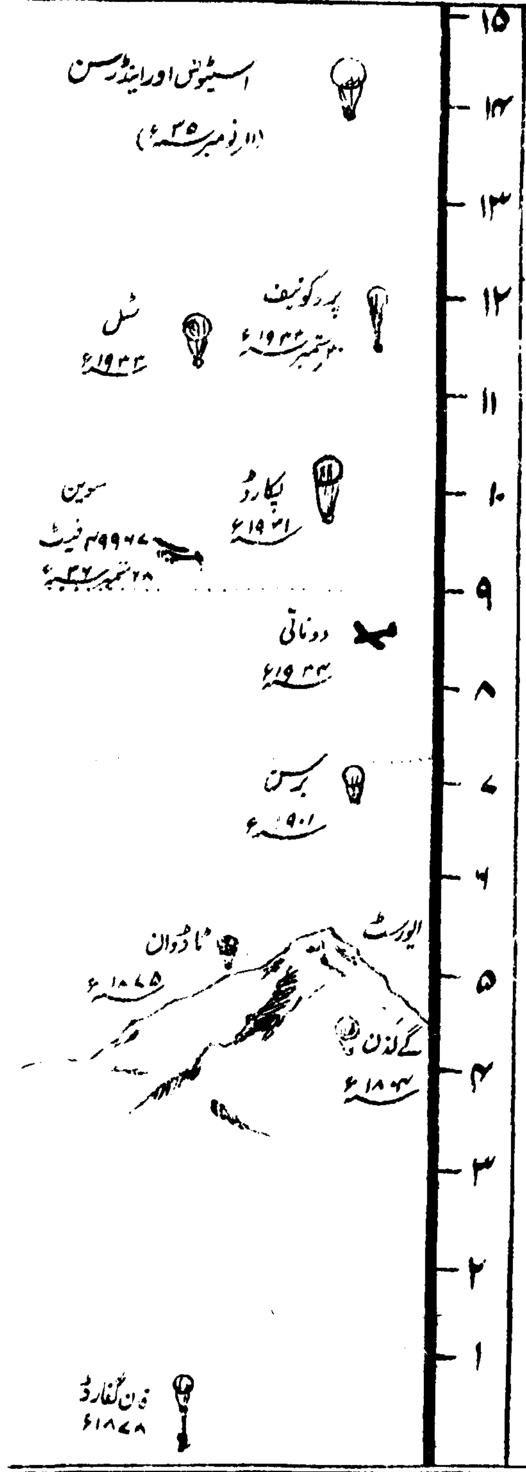


جہاں سے جہاز چلتے ہیں دوسری طرف سورج ہے۔ بیچ میں عطارد اور زہرہ ہیں۔ اگر اس فاصلے کو جوڑ لیا جائے جو دنیا کے سارے ہوائی جہازوں نے ۳۴ء میں طے کیا تھا تو زمین سے سورج تک کا فاصلہ ہو جاتا ہے۔ خالی امریکہ کے جہازوں نے جو فاصلے طے کئے وہ مریخ تک پہنچا دینے کو بس کرتے ہیں۔ اسی نسبت سے بعض دوسرے ملکوں کے ہوائی جہازوں کے سفروں کے فاصلے بھی ظاہر کئے گئے ہیں۔

تیسری تصویر سے معلوم ہوگا کہ ۳۴ء میں کتنے آدمیوں نے ہوائی جہاز سے سفر کیا۔

چوتھی تصویر سے معلوم ہوگا کہ مختلف ملکوں نے اپنی ڈاک کے لئے اور باربرداری کے لئے ہوائی جہازوں سے کتنا کام لیا۔ ڈاک کا کام سب سے زیادہ ریاستہائے متحدہ امریکہ اور جرمنی نے لیا ہے۔ اور باربرداری کا کینیڈا اور جرمنی نے۔ اس کے بعد اوروں کا نمبر آتا ہے۔

لیکن یوں دُور دُور اُڑنے اور ہوا پر
قابو پانے پر بھی یہ آدمی کہاں بس کرتا ہے۔
خالی ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ گئے
اور اپنا سامان بھیج دیا یا خط بھیج دئے تو کیا
ہوا۔ یہ بھی تو پتہ چلانا چاہئے کہ اوپر ہو کیا رہا
ہے۔ اس کام کے لئے ہوائی جہاز بہت
کام نہیں دیتے۔ ہوائی جہاز تو ابھی کُل ۱۵
ہزار میٹر کی اونچائی کو بھی نہیں پہنچا۔ ابھی
حال میں ایک فرانسیسی ۱۴۸۳۶ میٹر یعنی
کوئی ۹ ۱/۴ میل کی اونچائی پر اُڑا تھا اور آدمی
بھلا اس پر کیسے قانع ہو جائے۔ وہ تو اوپر
جانا چاہتا ہے اور اوپر۔ اس کام کے لئے
وہ غباروں کا استعمال کرتا ہے۔ ابھی حال
میں دو امریکن ایک غبارے میں اُڑے
تھے اور ۲۲ ہزار ۶۰۰ میٹر کی اونچائی تک
پہنچے۔ غبارے میں طرح طرح کے آلات
لگائے گئے تھے جن سے ہوا کی ہریت
کا حال اچھی طرح معلوم ہوتا جاتا تھا اور چونکہ
سردی کی وجہ سے اُڑنے والے تو



نوٹ یہ ہندسے میلوں کے ہیں۔

آلات میں سب باتیں بڑھ نہ سکتے تھے اس لئے ہر آلہ کے ساتھ ایک فوٹو کا کیمرا لگا تھا - سب کچھ چھپتا جاتا تھا - ہر پرت کی رنگین فلمیں بھی اسی کے ساتھ ساتھ بنتی گئیں۔

خیال ہے کہ اگر ہوا کی اوپر کی پرتوں کا حال اچھی طرح معلوم ہو جائے اور پھر ہوائی جہاز اس اونچائی سے اُڑ سکیں تو ۳-۴ سو میل فی گھنٹہ کے حساب سے تو بآسانی سفر کر سکتے ہیں اور ہزار میل فی گھنٹہ کا خواب بھی بعض لوگ دیکھ رہے ہیں - ساری دنیا بس ایک چھوٹا سا شہر بن جائیگی - ساتھ والی تصویر میں یہ دکھایا ہے کہ غباروں میں مختلف لوگ کتنی اونچائی تک پہنچتے ہیں - اونچائی کے اندازہ کے لئے بیچ میں کوہ ایورسٹ کو بھی اسی نسبت سے بنا دیا ہے - دیکھو آدمی غباروں میں ایورسٹ سے کس قدر اوپر پہنچ گیا ہے ◆

اس مضمون میں کئی جگہ "میٹر" کا لفظ آیا ہے - جانتے ہو میٹر کیا ہوتا ہے - میٹر لمبائی ناپنے کا ایک پیمانہ ہے - ہزار میٹر کا ایک کلومیٹر ہوتا ہے - جیسے ہزار گرام کا ایک کلوگرام ہوتا ہے - یہ فرانسیسی پیمانہ ہے اور سارے یورپ میں اس کا رواج ہے - فرانسیسی پیمانوں میں یہ خوبی ہے کہ بڑھتے ہیں تو دس گنے ہو جاتے ہیں، گھٹتے ہیں تو دسواں حصّہ ہو جاتا ہے - دس سے ضرب دینے اور تقسیم کرنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے - انگریزی پیمانوں میں ۳ اور ۱۲ اور ۲۰ سے ضرب تقسیم کرنی ہوتی ہے - اچھا تو ایک کلومیٹر کے میل کتنے ہوتے ہیں - کوئی ۶ر سمجھے یہ ۶ر کیا ہوا - یہ ہوا $\frac{6}{10}$ یعنی کسی جُز کے ۱۰ حصّے کئے اور ان میں ۶ لئے تو اُسے $\frac{6}{10}$ یا ۶ر لکھینگے - تو کلومیٹر ہوا میل کا $\frac{6}{10}$ تقریباً - بس اگر کلومیٹر کے میل بنانا ہو تو ۶ سے ضرب دیکر ۱۰ سے

کھیل اور کام

جناب حمدی صاحب فیروز پوری

کام کرنے والے

بادشاہ .... تین سارنگی والے

تین طبلچی .... تین شہنائی نواز

دو خادم .... ڈاکٹر سخت دل

ایک مزدور لڑکا

لباس

بادشاہ ۔ گتّے کا بنا ہوا تاج جس پر سنہری کاغذ لگا ہو سُرخ قمیص، نیلے رنگ کا جبہ جس پر چھوٹے سلمے ستارے کا معمولی کام بنا ہو سفید نکر گھٹنوں تک جرابیں

سارنگی والے ۔ لمبی نیلی جرابیں، سُرخ قمیص، نیلی پٹیاں۔

طبلچی ۔ لمبی جرابیں۔ سبز قمیص، سُرخ پٹیاں۔

شہنائی نواز ۔ لمبی سبز جرابیں۔ سُرخ قمیص۔ سبز پٹیاں۔

خادم ۔ لمبی سُرخ جرابیں، سُرخ قمیص۔

ڈاکٹر ۔ سیاہ جبہ، اونچی ٹوپی۔

بادشاہ کا دربار

اس ڈرامے کے کھیلنے کے لئے کسی خاص اہتمام کی ضرورت نہیں۔ چند پردے پس منظر کا کام دے سکتے ہیں اگر کمرے میں کھیلا جائے تو اس کے داہنی طرف ایک دریچہ اور بائیں جانب دروازہ ہو تو بہتر ہے۔ ورنہ پردوں ہی سے کام چلا لیا جائے۔ بادشاہ کے تخت کے لئے ایک کرسی کافی ہے جس پر رنگین بیل بوٹے کی چادر پڑی ہو۔ جب پردہ اٹھے تو بادشاہ تخت پر بیٹھا ہو چہرے سے پریشانی ظاہر ہو۔ سر کو داہنے ہاتھ کا سہارا دے کر ذرا آگے جھکائے ہو۔ تخت کے دونوں طرف ایک ایک خادم ہو۔ ان کے چہرے بھی مغموم اور پریشان ہوں

پہلا منظر

بادشاہ ۔ (کراہتے ہوئے) ہائے! ہائے۔ کیا دنیا میں کوئی ایسی چیز نہیں جس سے میں دل بہلا سکوں؟

پہلا خادم (آگے بڑھ کر) بادشاہ سلامت کیا میں سارنگی والوں کو بلاؤں

بادشاہ ۔ بہتر بُلا دیکھو ۔ شاید وہ کوئی نیا نغمہ سُنائیں۔

(خادم دروازے کی طرف جاتا اور پکارتا ہے)

پہلا خادم ۔ سارنگی والو ! بادشاہ سلامت تمھیں یاد فرما رہے ہیں۔

(تینوں سارنگی والے اپنا اپنا ساز بغل میں دبائے آہستہ آہستہ داخل ہوتے اور جھک کر بادشاہ کو سلام کرتے ہیں)

(فرش پر بیٹھ جاتے ہیں ۔ ہر شخص آہ بھرتا ہے)

دوسرا خادم (آگے بڑھ کر) شاید حضور اپنے طبلچیوں یا شہنائی نوازوں سے کچھ سننا پسند فرمائیں۔

بادشاہ بہتر انھیں بھی بُلا دیکھو

دوسرا خادم (دروازے کی طرف جاتا اور پکارتا ہے) طبلچیو اور شہنائی نوازو ۔ بادشاہ سلامت تمھیں یاد فرما رہے ہیں۔



سارنگی والے ۔ (غم ناک آواز میں) کیا حضور سارنگی سننا چاہتے ہیں۔

بادشاہ کیا تمھیں کوئی نیا نغمہ آتا ہے ؟

سارنگی والے نہیں حضور

بادشاہ تو پھر مجھے تکلیف دینے کی ضرورت نہیں

سارنگی والے (اطمینان کا سانس لے کر) شکریہ حضور

(تینوں طبلچی اور شہنائی نواز داخل ہوتے ہیں اور جھک کر بادشاہ کو تعظیم بجالاتے ہیں۔)

شہنائی نواز ۔ کیا حضور کی خواہش ہے کہ ہم اپنے ساز چھیڑیں

بادشاہ کوئی خاص ضرورت نہیں ۔ خیر تم اپنا کام شروع کرو

شہنائی نواز شہنائیاں بجانے لگتے ہیں اس قدر مکروہ آواز نکلتی ہے کہ حاضرین کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں۔ اور ہر ایک کے ماتھے پر بل پڑ جاتے ہیں

بادشاہ (چلا کر) روکو! روکو! بس اس موسیقی کو اگر تم اچھی طرح نہیں بجا سکتے تو خدا کے لئے چپ رہو۔

تینوں شہنائی نواز۔ شکریہ حضور

بادشاہ۔ (طبلچیوں سے مخاطب ہو کر) میرا خیال ہے تمہارا بھی یہی حال ہے۔

پہلا طبلچی۔ اعلیٰ حضرت! میرا طبلہ ٹوٹ گیا۔

دوسرا طبلچی۔ حضور! مجھے افسوس ہے کہ میری ایک چھڑی گم ہو گئی ہے۔

تیسرا طبلچی۔ حضور! میں اکیلا بجانے کے ناقابل ہوں۔

بادشاہ۔ ہاں میں جانتا ہوں (ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے) کوئی نئی چیز نہیں جس سے دل بہلایا جا سکے۔ جو میری مصیبت کو کچھ ہلکا کر سکے۔ آہ! یہ دنیا کس قدر بے لطف جگہ ہے۔ میں موسیقی سے بیزار ہو چکا ہوں۔ ناچ کو میں بالکل پسند نہیں کرتا۔ ہر شخص میرے حال سے واقف ہے۔ پھر بھی کوئی ایسا نہیں جو میرے لئے تسکین کا کچھ سامان بہم پہنچا سکے درباریو! سوچو، خوب غور کرو۔ شاید کوئی نئی چیز مل سکے۔

سب درباری سر کھجانے لگتے ہیں گویا انتہائی غور و فکر کی حالت میں ہیں۔ پہلا خادم آگے بڑھتا ہے۔

پہلا خادم۔ حضور کیا یہ مناسب نہیں کہ ڈاکٹر سخت دل سے مدد لی جائے

بادشاہ ہاں ـــــ شاید ـــــ اچھا اسے بلاؤ۔

خادم باہر چلا جاتا ہے۔ ہر شخص کے چہرے پر بشاشت کے آثار نمودار ہوتے ہیں طبلچی شہنائی نواز اور سارنگی والے اپنا اپنا ساز صاف کرتے ہیں۔ بادشاہ تاج سیدھا کرتا اور منتظر بیٹھ جاتا ہے۔

خادم کے پیچھے پیچھے ڈاکٹر سخت دل ہاتھ میں ایک سیاہ تھیلا پکڑے اور بغل میں ایک موٹی سی کتاب دبائے داخل ہوتا اور جھک کر بادشاہ کو سلام کرتا ہے۔



ڈاکٹر سخت دل ۔ اعلیٰ حضرت، اور حاضرینِ دربار!
صباح بخیر۔ حضور نے مجھے کس لئے یاد فرمایا ہے؟

بادشاہ ۔ ڈاکٹر صاحب! بات یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص
ہر چیز سے اُکتا گیا ہے۔ موسیقی سے، ناچ سے
کھیلوں سے، اب ہم کوئی نئی چیز چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر سخت دل ۔ اچھا یہ بات ہے۔ مجھے ذرا اپنی کتاب کا
مطالعہ کر لینے دیجئے۔

ڈاکٹر کتاب کھولتا ہے۔ اس کے ماتھے پر کبھی
بل پڑتے ہیں۔ کبھی اُترتے ہیں۔ ہر شخص مضطرب
نگاہوں سے اُسے دیکھ رہا ہے۔ اچانک باہر سے
گانے کی آواز آتی ہے جو قریب ہوتی جاتی ہے۔

گانا

کہتے ہیں بادشاہ کو آرام ہے پسند
درباریوں کو اس کے فقط نام ہے پسند
ہم سے جو پوچھو بھائی ہمیں کام ہے پسند
عاشق ہمارا کام تو ہم کام پر فدا
ہمدرد اس سے بڑھ کے نہ کوئی ہمیں ملا
پیدا ہی کام کے لئے ہم کو کیا گیا
آقا ہمارے دیتے ہیں گو رنج بے شمار
اُجرت بھی پوری ملتی نہیں ہم کو زینہار (ہرگز)
جان اور دل سے پھر بھی ہمیں کام سے ہے پیار
دن بھر کے کام کاج سے فارغ جونہی ہوئے
جو مل گیا سو کھا لیا اور کھا کے سو رہے
اُٹھے جو دن کو چل دئے پھر کام ڈھونڈنے

بادشاہ ۔ الٰہی خیر! یہ کیا؟

پہلا سارنگی والا ۔ (دریچے میں سے باہر کی طرف دیکھتا ہے)
حضور ایک مزدور لڑکا گا رہا ہے۔ پھٹے پرانے کپڑے
پہنے ہے لیکن بے حد مسرور نظر آ رہا ہے

ڈاکٹر سخت دل دھماکے کے ساتھ کتاب بند کر دیتا ہے

ڈاکٹر سخت دل ۔ درست، درست۔ بالکل درست
اعلیٰ حضرت آپ کی تکلیف کا باعث صرف یہ ہے
کہ آپ کچھ کام نہیں کرتے ہر وقت کھیلنا بھی انسان
کے لئے مضر ہے اور ہر وقت کام کرنا بھی مضر!

بادشاہ ممکن ہے تمہارا خیال درست ہو۔ لیکن میں کیا
کر سکتا ہوں۔

ڈاکٹر سخت دل ۔ میں ابھی عرض کرتا ہوں۔ براہِ کرم
کسی کو بھیج کر اس لڑکے کو بلوائیے

بادشاہ کوئی جا کر اسے بلا لائے۔

پہلا خادم بہتر حضور۔

خادم باہر جاتا اور تھوڑی دیر میں لڑکے کو ساتھ لئے
داخل ہوتا ہے۔ لڑکے کے ہاتھ میں ایک پھاوڑا ہے
وہ جھک کر بادشاہ کو سلام کرتا ہے۔

بادشاہ ۔ لڑکے مجھے بتاؤ۔ تم اتنے خوش کیوں ہو؟

مزدور لڑکا ۔ حضور آسمان نکھرا ہوا ہے۔ سورج چمک
رہا ہے راستے برف سے اٹے ہوئے ہیں کیا یہ چیزیں
کسی کو خوش کرنے کے لئے کافی نہیں؟ میں تمام دن
محنت کروں گا۔ رستوں پر سے برف ہٹاؤں گا
شام کو مجھے مزدوری ملے گی۔ اسے جس طرح چاہوں گا
خرچ کروں گا۔ کیا یہ سب مجھے خوش کرنے کو کافی نہیں؟

ڈاکٹر سخت دل ۔ ملاحظہ فرمایا حضور نے ۔ وہ محنت کرتا ہے اس لئے خوش ہے

بادشاہ : تخت سے اُٹھتے ہوئے ، درست ہے ڈاکٹر صاحب ! اُٹھو لوگو ! ہم سب باہر جاکر رستوں پر سے برف ہٹائیں

تمام اہل دربار (خوش ہوکر) جو ارشاد حضور

سازندے اپنے ساز پھینک دیتے ہیں اور بادشاہ کے پیچھے پیچھے ہنستے ، باتیں کرتے جارہے ہیں

(پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

دوسرا منظر

منظر وہی پہلا ہے۔ لیکن دریچے پر پردہ پڑا ہوا ہے ۔ اگر ممکن ہو تو لیمپ روشن کر دیے جائیں



تاکہ معلوم ہو کہ اب شام ہے ۔

بادشاہ داخل ہوتا ہے اس کے پیچھے دونوں خادم ہیں ۔ سب کے ہاتھوں میں پھاوڑے ہیں ۔

بادشاہ ۔ دوستو ! آؤ ہم ایک بار پھر خوشی منائیں سارنگی والو کچھ سناؤ ۔

سارنگی والے اپنا ساز اُٹھاتے ہیں لیکن جب
بجانے کی کوشش کرتے ہیں تو کراہتے سکتے ہیں
کیوں کہ اُن کے ہاتھ سردی سے سن ہو چکے ہیں
بادشاہ :- (ہنستا ہے) معلوم ہوتا ہے کہ تم محنت کے عادی
نہیں (کھڑے ہوکر ہاتھ سے سب کو خاموش
رہنے کا اشارہ کرتا ہے) مجھے ایک اعلان

پہلا خادم - ڈاکٹر سخت دل حضور سے ملاقات کے
خواہاں ہیں
بادشاہ انھیں بلاؤ -
ڈاکٹر سخت دل اعلیٰ حضرت میں فیس کے لئے داخل ہوا ہوں
بادشاہ - فیس کیسی ؟ کیا تم نے مجھے کوئی دوا دی تھی -
ڈاکٹر سخت دل - اعلیٰ حضرت ! اور یہ محنت و مشقت دوا



کرتا ہے - آیندہ میرے دربار کے ہر شخص کو چار
گھنٹے روزانہ کام کرنا لازم ہے سستی اور کاہلی
نیست و نابود کرنے کا یہی واحد علاج ہے سُن
لیا سب نے ؟
سب درباری - (سر جھکا کر) جو ارشاد
(پہلا خادم داخل ہوتا ہے)

نہیں تو کیا ہے ! کیا آپ اس سے تندرست اور
بشاش نہیں ہو گئے ؟
بادشاہ - درست کہتے ہو - میں اپنی پچھلی حالت بھول گیا تھا
خادم ! ڈاکٹر صاحب کو میرے خزانے سے اشرفیوں
کی ایک تھیلی دے دو -
(خادم حکم کی تعمیل کرتا ہے)

ڈاکٹر سخت دل۔ (آداب بجالاکر) میں حضور کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں اور اب چونکہ میری خدمات کی ضرورت نہیں رہی اس لئے آپ سے رخصت ہونے کی اجازت چاہتا ہوں۔ اعلیٰ حضرت اور حاضرینِ دربار۔ الوداع۔

حاضرینِ دربار۔ الوداع، ڈاکٹر سخت دل، الوداع۔

بادشاہ۔ خادم! اس مزدور لڑکے کو بلاؤ تاکہ وہ ہمارے جشن مسرت میں شریک ہوسکے۔

خادم باہر چلا جاتا اور تھوڑی دیر میں مزدور لڑکے کو ساتھ لئے داخل ہوتا ہے۔ لڑکا آداب بجالاتا ہے۔

بادشاہ۔ لڑکے تم نے ہمیں کام کرنا سکھایا اس کے عوض ہم تمھیں انعام دینا چاہتے ہیں۔ خادم! اسے اشرفیوں کی ایک تھیلی دے دو۔

(خادم تعمیل کرتا ہے)

مزدور لڑکا۔ شکریہ حضور

بادشاہ۔ جانے سے پہلے ہمیں اپنا گیت ایک بار پھر سناؤ

(لڑکا گاتا ہے)

کہتے ہیں بادشاہ کو آرام ہے پسند
درباریوں کو اس کے فقط نام ہی پسند
ہم سے جو پوچھو بھائی ہمیں کام ہی پسند
الخ ....

(پھر سب مل کر گاتے ہیں)

کام جہاں میں سب سے نرالا
کام کا ہر دم بول ہے بالا
کام کروگے عیش کروگے
بے کاری میں دکھ ہی بھروگے
بے کاری ہے زحمت بھائی
باکاری ہے رحمت بھائی
قول یہ حمدی کا نہ بھلانا
کام سے ہرگز جی نہ چرانا

(گانے کے بعد سب خوشی سے تالیاں بجاتے ہیں۔)

بادشاہ۔ آج مجھے معلوم ہوگیا کہ انسانی زندگی پر کام کا کتنا اثر ہے۔ وہ لوگ جو کچھ کام نہیں کرتے۔ ہمیشہ اداس اور مغموم رہتے ہیں۔ آج سے پہلے میرا جو حال تھا تم سب کو معلوم ہے کیا میں اب وہی پہلا سا انسان ہوں؟ نہیں ہرگز نہیں۔ کام نے مجھ میں زندگی اور مسرت کی روح پھونک دی ہے۔ اب میں ایک ایسا انسان ہوں جس کے حوصلے بلند۔ خیالات پاکیزہ اور ارادے مضبوط ہیں۔ اے کام تجھ پر خدا کی رحمت ہو۔

(دربار برخاست)

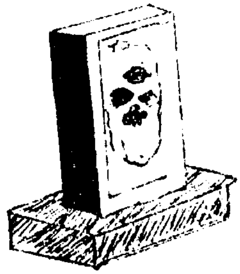
پردہ

ہوا کا دباؤ

(از ابوطاہر داؤد صاحب بی ایس سی، لک)

دیاسلائی کا ایک خالی بکس مع اس کے ڈھکنے کے لے کر تجربہ کرو۔ خالی بکس الٹا کر میز پر رکھو اور اس کے اوپر اس کا ڈھکنا کھڑا کر دو

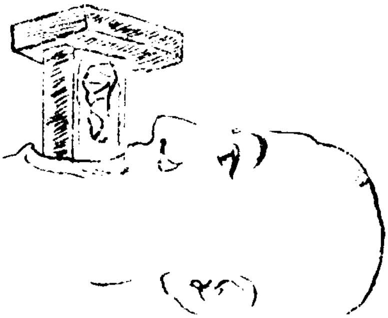
اب ہم یہ چاہتے ہیں کہ بکس اور اس کے ڈھکنے کو اس طرح ترتیب دیں کہ ڈھکنا نیچے رہے اور بکس اس کے اوپر قائم ہو جائے ...... لیکن خبردار ہاتھ نہ لگنے پائے۔ کیا تم بغیر ہاتھ لگائے ہوئے ایسا کر سکتے ہو؟



(تصویر نمبر ۱)

لو اپنا منہ ڈھکنے کے کھلے ہوئے منہ پر رکھو اس کے بعد ایک گہری سانس اندر کو کھینچ کر ڈھکنے کی ہوا کھینچ لو اور اس کے بعد اسی حالت میں فوراً ہی سر کو پیچھے کی طرف لے جاؤ

اب بکس اوپر ہے اور اس کا ڈھکنا نیچے۔ یہی تو ہم چاہتے تھے۔ دیکھو یہ دونوں اس طرح ایک دوسرے سے چپکے ہوئے ہیں۔ گویا ہم نے دونوں کے درمیان گوند لگا دیا۔ آخر اس کا سبب کیا ہے۔ کونسی چیز ہے جو بکس کو ڈھکنے پر قائم کئے ہوئے ہے۔ اور اس کو اوپر سے



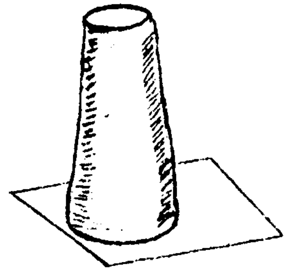
(تصویر نمبر ۲)

گرنے نہیں دیتی۔ شاید کوئی چیز اس کو اندر سے پکڑ کر کھینچ رہی ہے۔ لیکن ہمیں نظر نہیں آتی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ڈھکنے کے اندر کی ہوا ہم نے اپنے منہ سے کھینچ لی ہے۔ مگر بکس کے اوپر کی ہوا میں کوئی فرق نہیں آیا ہے یعنی بکس کے نیچے ہوا کا دباؤ بالکل نہیں ہے اور بکس کے اوپر ہوا کا دباؤ بہت ہے۔ اس لئے بکس ڈھکنے کے اوپر اس طرح چپک گیا کہ ہل نہیں سکتا۔ اس لئے

"معلوم ہوا کہ ہوا نیچے کی طرف دباؤ ڈالتی ہے"

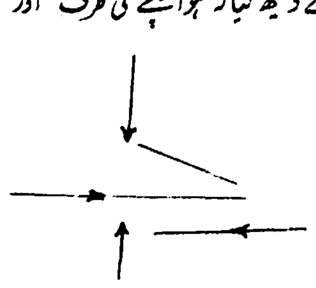
اس کے بعد ایک دوسرا تجربہ ہے۔ شیشے کا گلاس لے کر اس میں لبالب پانی بھر دو اور اس کے منہ پر ایک پوسٹ کارڈ رکھ دو۔ پھر پوسٹ کارڈ پر اپنا ہاتھ رکھ کر آہستہ سے اپنا ہاتھ الٹ دو۔

تم نے کیا دیکھا؟... کیا تم نے یہ خیال نہیں کیا تھا کہ گلاس الٹا کرتے ہی پوسٹ کارڈ



شکل نمبر ۳

نیچے گر جائے گا اور پانی بھی۔ لیکن یہاں تو معاملہ کچھ اور ہی ہے۔ پوسٹ کارڈ اسی طرح گلاس کے منہ پر لگا ہوا ہے اور پانی اسی طرح گلاس میں بھرا ہوا ہے۔ اس کی کیا وجہ؟ گلاس کا تمام پانی پوسٹ کارڈ پر زور ڈال کر کیوں نہیں بہہ جاتا۔ شاید اس کا زور یا دباؤ کسی اور چیز کے دباؤ سے کم ہے۔ وہ کون سی چیز ہے؟ یقیناً یہ ہوا ہے کہ جو پوسٹ کارڈ کے نیچے سے دباؤ ڈال رہی ہے یعنی پانی پوسٹ کارڈ کو نیچے دبا رہا ہے اور ہوا اس کو اوپر اٹھا رہی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہوا اوپر کی طرف بھی دباؤ ڈالتی ہے۔ ہم نے دیکھ لیا کہ ہوا نیچے کی طرف اور اوپر کی طرف دباؤ ڈالتی ہے۔ کیا دونوں کی طرف بھی دباؤ ڈالتی ہے؟



ایک ہی طرح کی دو شیشے کی تختیاں لے کر پانی میں رکھ دو۔ پھر ان کو نکال کر ایک دوسرے کے اوپر رکھو۔ اب تم ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کی کوشش کرو۔ کیا محسوس ہوتا ہے؟ جدا نہیں ہوتیں! اچھا اوپر سے زور لگاؤ۔ نیچے سے زور لگاؤ۔ دہنی طرف سے کوشش کرو۔ بائیں طرف سے کھینچو۔ اچھا چھوڑ دو۔ یہ تختیاں کسی طرف سے بھی جدا نہیں ہوتیں۔ آخر اس کی وجہ؟ تختیوں کے بیچ میں پانی ہے۔ ہوا نہیں ہے۔ تختیوں کے اوپر ہوا ہے یعنی اُن کے چاروں طرف ہوا اتنا دباؤ ڈال رہی ہے کہ تختیاں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتیں۔

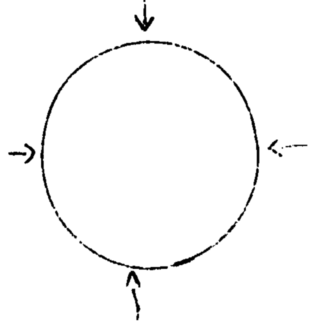
اس سے معلوم ہوا کہ ہوا نہ صرف اوپر کی طرف اور نیچے کی طرف دباؤ ڈالتی ہے بلکہ دونوں طرف بھی دباؤ ڈالتی ہے۔

تم نے ایک نلکی سے صابن کے پانی کے "بلبلے" چھوڑنے کا کھیل کھیلا ہے؟ نہیں کھیلا ہے تو دیکھا ہوگا۔ پانی کے یہ بلبلے بالکل گول کیوں رہتے ہیں۔ اُن کے اندر کیا بھرا ہوتا ہے؟ تم خود سمجھ سکتے ہو کہ اس میں سوائے ہوا کے اور کیا چیز ہو سکتی ہے یہ ہوا پانی کے قطرے کے اندر ایسا پھیلتی ہے کہ ذرا سا پانی ربڑ کے پھکنے کی طرح پھول جاتا ہے اور چونکہ ہوا کا دباؤ ہر طرف سے برابر ہوتا ہے اس لئے اس بلبلے کی شکل بالکل گول ہوتی ہے۔ اگر کہیں سے کم زیادہ ہوتا تو اس کی شکل بھی ایسی مکمل نہ رہتی۔

اب اس کے بعد ہم یہ دیکھیں گے کہ یہ ہوا کس قدر دباؤ ڈالتی ہے۔

دوسرے تجربے میں ہم معلوم کر چکے ہیں کہ ہوا

کے دباؤ نے گلاس کے اندر کے پانی اور اس پر لگے ہوئے پوسٹ کارڈ کو کس طرح سہارا لیا تھا۔ اب تم ایک بڑی

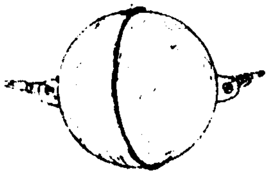


گاجر لو اور اس حصے پر سے جہاں وہ سب سے زیادہ چوڑی ہے اس کو کاٹ لو اور پھر اس کے چکنے حصے کو چینی کی ایک بڑی پلیٹ پر رگڑو۔ تھوڑی دیر میں وہ اس طرح چسپاں ہو جائے گی کہ اگر تم اس کو اوپر اٹھاؤ گے تو اس کے ساتھ وہ وزنی پلیٹ بھی اُٹھ آئے گی۔



اسی طرح دو کان دار ربڑ کے گول ٹکڑوں کو پانی سے تر کر کے شیشوں پر لگا کر دبا دیتے ہیں۔ اور ان میں وہ چیزیں ٹانگ دیتے ہیں جن کی انھیں نمائش کرنا مقصود ہوتی ہے۔ ان ٹکڑوں پر ہوا کا دباؤ اس قدر ہوتا ہے۔ کہ کہ وہ ان وزنی چیزوں کا بوجھ سہار لیتے ہیں۔ اسی اصول پر پرانے زمانے میں ایک بڑے سائنس داں نے ہوا کے

دباؤ کا ایک بڑا کرشمہ دکھایا ہے اس کا نام میگڈی برگ (MAGDEBURG) تھا۔ اور وہ جرمنی کا رہنے والا تھا۔ اس نے دھات کے دو بڑے بڑے پیالے خاص طور پر ایسے بنوائے تھے جو بالکل ایک ہی جسامت کے تھے

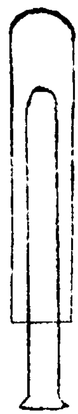


اور ان کے منہ ایک دوسرے سے ملا کر رکھ دئے جاتے تو بالکل فٹ آجاتے۔ اس کے بعد اس نے ان دونوں کے اندر کی ہوا "ہوا نکالنے کے پمپ" سے خارج کر دی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں پیالے ایک دوسرے سے بالکل جُڑ گئے۔ اب اس نے اُن کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کے لئے کتنا ہی زور مارا۔ لیکن یہ علیحدہ نہ ہوئے۔ اس کے بعد اس نے گھوڑوں کی طاقت سے ان کو علیحدہ کرنے کی کوشش کی لیکن پھر بھی جدا نہ ہوئے یعنی پیالوں کی بیرونی سطح پر ہوا کا دباؤ اس قدر تھا کہ اس کے مقابلے میں گھوڑوں کی طاقت بالکل بے کار ہو گئی۔

ہوا کے دباؤ کے اسی اصول پر بہت سے دلچسپ تجربے کئے جا سکتے ہیں۔ اگر تمھارے پاس شیشے کی امتحانی نلیاں ہوں تو تم ذیل کا تجربہ خود کر سکتے ہو۔

تم ایسی دو نلیاں لو جن میں سے ایک چوڑی ہو اور ایک اتنی پتلی ہو کہ وہ آسانی سے چوڑی نلی میں داخل کی جا سکے، اب تم چوڑی نلی میں پانی بھر دو۔ اور اس

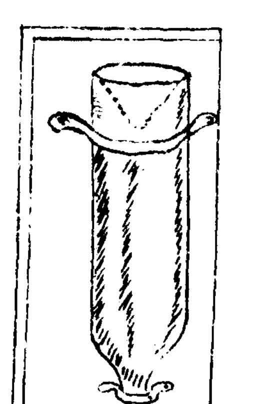
بعد پتلی نلی کو چوڑی نلی کے منہ پر رکھ کر آہستہ سے دباؤ یہاں تک کہ وہ تقریباً آدھ انچ تک اس میں داخل ہو جائے اب اس کے بعد دونوں نلیوں کو اُلٹ دو۔ یعنی اُن کا منہ زمین کی طرف کرو۔ پھر چوڑی نلی کو ایک انگوٹھے اور انگلی سے پکڑے رہو۔ اور پتلی نلی کو بالکل چھوڑ دو۔ ڈرو نہیں۔ تمھاری پتلی نلی زمین پر گر کر چکنا چور نہیں ہو گی۔ ہائیں! یہ تو گرنے کے بجائے چوڑی نلی میں آہستہ آہستہ داخل ہوتی جا رہی ہے۔ تم اگر اس کی وجہ پوچھنا چاہتے ہو تو اب میں اس قدر بیان کر چکا ہوں، کہ زیادہ بتانا مناسب نہیں سمجھتا۔ تم خود سوچ لو۔



تم اپنے دوستوں سے مذاق کرنے کے عادی ہو۔ ذیل کا تجربہ کر کے تم اپنے دل کو خوش کر سکتے ہو۔ تمھاری والدہ یا بہن کے پاس عطردان تو ضرور ہو گا اور اس میں عطر کی شیشیاں بھی ضرور ہوں گی۔ ایک خالی شیشی۔ جس کے منہ پر شیشے کی ڈاٹ لگی ہوئی ہو۔ اُن کی اجازت سے لے لو اس کے بعد اُس کے پیندے میں ایک باریک سا سوراخ یا تو خود کر لو، یا کسی دوکان دار سے کرا لو۔ میرے خیال میں دوسری ہی صورت بہتر ہو گی کیونکہ تم سوراخ کرنے کی کوشش میں شیشی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ جب ایسا سوراخ، ہو جائے تو شیشی میں رنگین پانی بھر کر جلدی سے ڈاٹ لگا دو اس مقام پر تم اپنے دل سے خود سوال کرو گے کہ یہ "لکھنے والے بھی عجیب آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ کہ شیشی کے پیندے میں سوراخ بھی کرا دیا اور اب اس میں پانی بھی بھروا رہے ہیں۔ بھلا سوچنے کی بات ہے کہ پانی اس میں کس طرح باقی رہے گا"؟ ہاں جناب میں کہتا ہوں کہ آپ کیوں گھبراتے ہیں۔ پانی بھر کر فوراً ڈاٹ لگا دیجئے۔ اگر پانی گر جائے تو میرا ذمہ! اس کے بعد وہ شیشی لئے ہوئے اپنے کسی دوست کے پاس جائیے اور ان سے کہئے کہ ...... "میں نے لکھنؤ سے آپ کے لئے بہت اچھا عطر منگایا ہے۔ ذرا سونگھئے تو سہی" لیکن یاد رکھئے کہ اس موقعہ پر آپ خود خاموش رہئے اور اپنی ہنسی کو دبائے رکھئے۔ نہیں تو سارا کھیل بگڑ جائے گا آپ کے دوست اپنے دانت نکال کر شیشی کو لینے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھا دیں گے۔ آپ اُس کو ان کے ہاتھ میں دے کر خاموش کھڑے ہو جائیے۔ وہ جیسے ہی اس کی ڈاٹ کھولیں گے۔ تمام شیشی کا پانی ٹُل ٹُل کر کے اُن کے کپڑوں پر گر جائے گا۔ اس وقت آپ ایک زوردار قہقہہ مار کر ہنسئے۔ اور اپنے دوست کے شرمانے کا لطف اُٹھائیے۔ بہتر ہو کہ یہ مذاق اپنی بھابی جان سے کیجئے۔ کیوں کہ بھابیاں عطر کی بہت شائق ہوتی ہیں۔ اب خود غور کیجئے کہ پہلی صورت میں شیشی میں سے پانی کیوں نہ گرا۔ اور دوسری صورت میں فوراً ہی کیوں گر پڑا؟

اس طرح آپ اپنی مرغیوں کے لئے ایک بہت ہی مفید چیز بنا سکتے ہیں۔ آپ کی مرغیاں نالیوں میں پانی پیتی پھرتی ہیں۔ کیوں نہ اپنے صحن میں ایک کونڈا رکھ دیجئے اور اس میں پانی بھر دیجئے۔ لیکن یہ کمبخت مرغیاں اکثر اوقات تمام پانی پی جاتی ہیں یا پانی بخارات بن کر اُڑ جاتا ہے تو کونڈا خشک پڑا رہتا ہے۔ اب ہر وقت جا کر دیکھنا کہ کونڈے میں پانی بھرا ہوا ہے۔ یا نہیں بہت تکلیف دہ بات

ہے ۔ ہم آپ کو ایک ترکیب بتاتے ہیں ۔ آپ ایک بوتل لے کر اس میں لبالب پانی بھر دیجئے اور اس کے منہ پر ایک کاگ لگا دیجئے ۔ اس کے بعد بوتل کا منہ نیچا کر کے اور پیندا اوپر کر کے آپ ایک دیوار سے لگا کر رکھئے ۔ اور ٹین کی پٹیوں سے اسے اس طرح جڑ دیجئے ۔ جیسا ذیل کی شکل میں ظاہر کیا گیا ہے ۔ اس کے بعد ایک کونڈے میں پانی بھر کر بوتل کے نیچے اس طرح رکھئے کہ اس کی گردن پانی میں ڈوبی رہے



پھر آہستہ سے بوتل کا کاگ نکال کر کھڑے ہو جایئے آپ دیکھیں گے کہ بوتل میں سے ذرا سا پانی نکل کر بند ہو گیا اور باقی بوتل میں پانی اسی طرح بھرا ہوا ہے ۔ یعنی کونڈے کے پانی کی سطح پر ہوا کا دباؤ پڑ رہا ہے اور یہی دباؤ بوتل میں پانی کے ستون کو قائم رکھے ہوئے ہے ۔ یہ پانی کا ستون اس وقت تک قائم رہے گا جس وقت تک کہ بوتل کا منہ کونڈے کے پانی میں ڈوبا ہوا رہے گا ۔ لیکن جب اسی کونڈے میں سے مرغیاں اتنا پانی پی لیں گی کہ اس کی سطح میں کمی آ جائے اور بوتل کا منہ پانی کی سطح کے اوپر دکھائی دینے لگے تو بوتل میں سے پانی فوراً باہر آ جائے گا ۔ یہاں تک کہ اس کا منہ پھر پانی میں ڈوب جائے گا ۔ کونڈے کے پانی پر ہوا کا دباؤ بوتل میں پانی کے ستون کو پھر قائم رکھے گا ۔ چنانچہ مرغیاں پانی پیتی رہیں گی ۔ اور بوتل میں سے پانی آہستہ آہستہ نکلتا رہے گا ۔ یہاں تک کہ تمام بوتل خالی ہو جائے گی ۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ تجربہ ہم ہر قسم کی بوتل پر کر سکتے ہیں یعنی زیادہ سے زیادہ ہم کتنی لمبی بوتل لے سکتے ہیں ۔ بالفاظ دیگر ہوا کا دباؤ پانی کے کتنے لمبے ستون کو قائم رکھ سکتا ہے ؟

اس کا جواب دینے کے لئے میں آپ کو ایک پرانا قصہ یاد دلاؤں گا (. . . . .) پرانے زمانے میں ایک سائنس داں تھا ۔ جس نے تیس فیٹ لمبی شیشے کی ایک بوتل بنائی تھی ۔ اس کو پانی سے بھر کر ایک ایسے ٹب میں جو لبالب تھا اُلٹ دیا تھا ۔ بھلا خیال کیجئے کہ جب تماشائیوں نے دیکھا ہو گا کہ پانی کا تیس فیٹ لمبا ستون خود بخود معلق ہے اور ظاہرا طور پر اس کو روکنے کے لئے نہ تو بوتل کے منہ پر کوئی کاگ ہے اور نہ کوئی ڈاٹ تو انھوں نے یقیناً اُس سائنس داں کو جادوگر خیال کیا ہو گا ۔ لیکن حضرت آپ تو پڑھے لکھے انسان ہیں ۔ اس میں جادو وادو کی کوئی بات نہیں ہے ۔ اگر آپ کے پاس اتنی لمبی بوتل ہو تو خود تجربہ کر کے دیکھ لیجئے ۔ ہاں اب سوال یہ ہے کہ پانی کے ستون کی اتنی لمبائی جس کو ہوا اپنے دباؤ سے قائم رکھے ۔ زیادہ سے زیادہ کتنی ہے ؟ تجربہ کر کے دیکھا گیا ہے کہ بتیس فیٹ سے زیادہ نہیں ہے ۔ یعنی اگر آپ چالیس فیٹ لمبی بوتل یا نلی یا پائپ لیں تو اس میں پانی کی سطح بتیس فٹ پر آ کر ٹھہر جائے گی ۔

یہی وجہ ہے کہ آپ اپنے کنوئیں سے جو کہ بتیس فٹ سے زیادہ گہرا ہو معمولی نلی کے ذریعے پانی نہیں کھینچ سکتے ۔ اس مقام پر ہمارا دوسرا اہم سوال پیدا ہو گیا ہے ۔ کیا ہوا

کا دباؤ پانی کے علاوہ کسی اور سیّال مادے کے ستون کو قائم رکھ سکتا ہے، تب اس تجربے کو کر ڈالیں۔ لیکن اس کے لئے ہم کونسا سیّال مادہ لیں؟ آئیے پارے سے بہتر اور کون سی چمک دار بہنے والی شے ہو سکتی ہے؟ ہم ایک ہاتھ بھر شیشے کی نلی لیتے ہیں جس کا منہ ایک طرف سے کھلا ہوا ہے اور ایک طرف سے بند ہے۔ کھلے ہوئے منہ میں ہم نے پارہ بھرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ساری نلی پارے سے بھر گئی۔ اس کے بعد ہم نے اس نلی کے کھلے ہوئے منہ پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے اس کو ایک ایسے برتن میں الٹ دیا جس میں پارہ بھرا ہوا ہے۔ لیجئے خدا کا شکر ہے کہ ہمارا تجربہ کامیاب رہا۔ جس طرح بوتل میں پانی کا ستون قائم تھا اسی طرح اس نلی میں بھی پارے کا ستون قائم ہے لیکن نلی کے سرے پر کچھ خالی جگہ ہے۔ جہاں سے



پارہ نیچے اتر آیا ہے۔ اس سے یہ مطلب ہے کہ اس بلندی سے زیادہ پارہ نہیں چڑھ سکتا آیئے اس کو ناپ لیں۔ اوہو! یہ تو کل تیس انچ ہے۔ آخر اس کا سبب کیا ہے کہ پانی تو بیس فٹ تک چڑھ جائے اور پارہ صرف تیس ہی انچ چڑھے۔ جناب اس میں تعجب کی کونسی بات ہے۔ اگر آپ مسٹر گاندھی اور مولانا شوکت علی کو ایک ریس میں تیز دوڑائیں تو کون آگے نکل جائے گا۔ اور کون جلد تھک جائے گا۔ ہاں، ہاں! گاندھی جی ہلکے پھلکے آدمی لمبے لمبے قدم رکھتے ہوئے بہت دور تک بھاگتے رہیں گے اور مولانا شوکت علی تھک کر ٹھہر جائیں گے اسی طرح پارہ بھاری چیز ہے وہ پانی کے مقابلے میں صرف تیس انچ چڑھ سکتا ہے

میں نے یہ تجربہ اپنے کئی دوستوں کو بتایا تھا جنھوں نے اس کو اپنے گھروں پر جا کر کیا ان میں سے ایک صاحب جو شملہ میں رہتے تھے انھوں نے جو اس کو کیا تو پارہ بجائے تیس انچ چڑھنے کے ...... چھبیس ...... ہی انچ چڑھا۔ وہ بڑے پریشان ہوئے اور انھوں نے مجھے خط لکھا۔ میں نے ان کو لکھا کہ بالکل ٹھیک ہے۔ تم یہ کس طرح امید کرتے ہو کہ پارہ ہر مقام پر اور ہر موسم میں ایک ہی بلندی تک چڑھے گا؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ ہوا کا دباؤ ہر جگہ ایک ہی جیسا ہے؟

یہ قاعدہ ہے کہ ہوا کا دباؤ ساحل سمندر پر زیادہ ہوتا ہے اور پہاڑوں پر کم۔ اس کے علاوہ گرمی کے موسم میں یہ دباؤ کم ہوگا اور جاڑوں کے موسم میں زیادہ۔ اگر تم چاہو خود تجربہ کر کے دیکھ سکتے ہو۔ البتہ اس دباؤ کی کمی زیادتی تم کو پارہ کے گھٹنے بڑھنے سے معلوم ہوتی رہے گی۔ ایسا آلہ جس کے ذریعے ہوا کا دباؤ ناپا جا سکے۔ آلہ باد پیما کہا جاسکتا ہے۔

دنیا میں مختلف مقامات پر ہوا کے دباؤ کی کمی زیادتی سے بڑے بڑے کام نکلتے ہیں۔ ذرا خیال تو کرو کہ ایک مقام پر ہوا کا دباؤ بہت زیادہ ہے اور اس کے قریب ہی دوسرا مقام ہے، جہاں ہوا کا دباؤ بہت کم ہے۔ آؤ اس سلسلے میں ہم ایک دلچسپ تجربہ کر ڈالیں۔

شیشے کی ایک بوتل لے لو۔ جس کا منہ تقریباً ایک انچ چوڑا ہو اور اس کا پیٹ پھولا ہوا ہو۔ اس کے بعد ایک کیلا لے کر اس کا چھلکا اس کے چوتہائی حصے تک چھیل ڈالو پھر بوتل کے اندر ذرا سا اسپرٹ ڈال کر اس میں جلتی ہوئی

ا؎ بہنے والے

دیا سلائی ڈال دو (اسپرٹ زیادہ ہرگز نہ ڈالو۔ ورنہ بوتل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی) بوتل کے اندر اسپرٹ جلنا شروع ہوگی اور اس کے اندر کی ہوا گرم ہو کر پھیلنا شروع ہوگی۔ یہ ہوا اب چونکہ بوتل میں سما نہیں سکتی۔ اس لئے نکلنے کے لیے راستہ تلاش کرے گی اور بوتل کے کھلے ہوئے منہ میں سے تمام کی تمام نکل جائے گی۔ یہاں تک کہ بوتل تقریباً بالکل خالی رہ جائے گی۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ بوتل کے پیٹ میں ہوا کے کم دباؤ کا خطرہ نمودار ہو گیا ہے اب آپ چھلے ہوئے کیلے کا سرا لے کر بوتل کے منہ پر لگا کر قدرت کا تماشہ دیکھیں۔ آپ دیکھیں گے کہ بوتل کے اندر کیلا خود بخود داخل ہو رہا ہے۔ اس طرح جیسے کوئی اس کو باہر سے اندر کی طرف ڈھکیل رہا ہو۔ اور جوں جوں یہ اندر داخل ہوتا ہے۔ ووں ووں اس کا چھلکا اترتا



جاتا ہے۔ جب تمام کیلا چھلا چھلایا اندر داخل ہو چکتا ہے تو ٹپاخ سے آواز بھی آتی ہے۔ اس کی کچھ وجہ سمجھ میں آتی ہے! میں بتا چکا ہوں کہ بوتل کے اندر ہوا کا دباؤ بہت کم ہے اور بوتل کے باہر ہوا کا دباؤ بدستور ہے در اصل یہ کیلا خود بخود داخل نہیں ہوا۔ بلکہ باہر کی ہوا نے اپنے دباؤ سے اس کو اندر ڈھکیل دیا اور جب تمام کیلا اندر داخل ہو گیا تو ہوا خود بھی بڑے زور کے ساتھ اندر داخل ہو گئی

اس سے ہم کو معلوم ہوا کہ اس مقام سے جہاں زیادہ دباؤ ہو اس مقام کی طرف جہاں کم دباؤ ہو ہوا چلتی ہے۔ لیکن ہم ذرا غور کریں تو معلوم ہوگا کہ بوتل کے اندر اور باہر کی ہوا کے دباؤ کا فرق صرف حرارت کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔ یعنی بوتل کے اندر کی ہوا گرم ہو کر پھیلی ہلکی ہوئی اور اوپر کو اٹھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے دباؤ میں کمی آگئی۔ باہر کی ہوا چونکہ مقابلتہً ٹھنڈی تھی اس لئے وہ نیچے کی طرف دباؤ ڈال رہی تھی۔ اس لئے باہر سے اندر کی طرف ہوا چلنا شروع ہوئی۔

یہی بات ہم کو اس وقت بھی نظر آتی ہے۔ جبکہ ہم دھواں نکلنے کی چمنی کی طرف دیکھتے ہیں۔ چولہے کے اوپر ہوا گرم ہو کر اوپر اٹھتی ہے اور باہر سے زیادہ دباؤ کی وجہ سے ہوا اندر آتی ہے۔ اسی طرح اگر ہمارے کمرے میں آگ جلتی ہو اور ہم اس کی طرف منہ کئے ہوئے بیٹھے ہوں تو ہماری پیٹھ کو سردی محسوس ہونے لگے گی۔ یعنی ٹھنڈی جگہ سے کہ جہاں ہوا کا زیادہ دباؤ ہے۔ ہوا گرم جگہ پر جہاں کم دباؤ ہے چل رہی ہے۔ اس طرح کمرے کے اندر ٹھنڈی ہوا کھچی ہوئی چلی آرہی ہے۔ یہ کیفیت نہ صرف ہمارے کمرے ہی میں ہو رہی ہے بلکہ تمام دنیا میں سال بھر متواتر ہوتی رہتی ہے۔ ہوا کی لہریں تمام سطح زمین پر چلا کرتی ہیں۔ انھیں لہروں کو ہم "پون" جھکڑ۔ آندھی وغیرہ ناموں سے موسوم کرتے ہیں۔ پون جس طرف سے چلتی ہے۔ ہم اسی سمت سے اس کو منسوب کر دیتے ہیں مثلاً پچھوا ہوا پچھم سے چلتی ہے۔ شمالی مشرقی تجارتی ہوا شمال مشرق سے چلتی ہے۔

ہوا کی تیزی اس کے دباؤ پر مبنی ہے۔ اگر دو مقامات کے درمیان ہوا کے دباؤ میں بہت زیادہ فرق

ہے تو یہ بڑی تیز رفتاری سے چلے گی اور بالکل طوفان معلوم ہوگی۔ اسی طرح اگر سطح ہموار ہے تو پانی آہستہ آہستہ بہے گا اور اگر پانی اونچائی پر سے گر رہا ہے تو آبشار بن جائے گا۔ یہی وجوہات ہیں کہ نسیم بحری، نسیم برّی، مانسون، جھکڑ، طوفان وغیرہ مختلف قسم کی ہوائیں چلا کرتی ہیں

لہٰذا ہم نے دیکھ لیا کہ

۱۔ ہوا وزن رکھتی ہے۔

۲۔ ہوا چیزوں پر چاروں طرف سے دباؤ ڈالتی ہے۔

۳۔ ہوا کے دباؤ کی وجہ سے پانی بتیس فٹ تک اوپر چڑھ جاتا ہے۔ اور پارہ تیس انچ تک چڑھتا ہے۔

۴۔ آلۂ بارپیما کے ذریعے ہم ہوا کے دباؤ کو ناپ سکتے ہیں۔

۵۔ جب پارہ گرتا ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ ہوا کا دباؤ کم ہوگیا۔ اور دوسرے مقامات سے ہماری طرف ہوا چلے گی ——

۶۔ جب پارہ بلند ہوتا ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ ہوا کا دباؤ زیادہ ہوگیا اور دوسرے مقامات کی طرف ہماری طرف سے ہوا چلے گی

۷۔ اگر پارہ جلد جلد گھٹتا بڑھتا ہے تو ہم سمجھ لیتے ہیں کہ آج موسم گڑبڑ ہے یہی وجہ ہے کہ آلہ بارپیما اس قدر کارآمد چیز ہے کہ ہوائی جہاز اس کے بغیر سفر ہی نہیں کر سکتے۔



میں کیا کروں گا

از جناب مولوی محمد حسین صاحب محوی صدیقی لکھنوی از مدراس

(خاص پیام تعلیم کے سالگرہ نمبر کے لئے)

جہاں تک بھی ممکن ہے محنت کروں گا — کبھی پست اپنی نہ ہمت کروں گا
میں سیکھوں گا علم و ہنر اچھے اچھے — نہ سستی کروں گا نہ غفلت کروں گا
غرض اپنی تعلیم سے ہو کے فارغ — وطن اور عزیزوں کی خدمت کروں گا
نہ ہوگی مرے دل میں نفرت کسی سے — برے کام سے ہاں میں نفرت کروں گا
مسلمان ہو، ہندو ہو یا ہو مسیحی — ہر ایک دیس بھائی سے الفت کروں گا
مرے دیس کے رہنے والے ہیں جتنے — میں ہر ایک کی دل سے چاہت کروں گا
رہیں مل کے سب جیسے ہوں بھائی بھائی — دلوں میں یہ پیدا محبت کروں گا
جو کمسن ہیں مجھ سے جو ہیں بھولے بھالے — میں ان ننھے بچوں پہ شفقت کروں گا
جو عمر و لیاقت میں مجھ سے بڑے ہیں — میں اپنے بزرگوں کی عزت کروں گا
نہ چاہوں گا ہرگز برا میں کسی کا — بھلائی میں سب کی اعانت کروں گا
بھلے کام سے میں نہ ہاروں گا ہمت — برے کام سے میں نہ رغبت کروں گا
جو پیش آئے گی مجھ کو راہِ وطن میں — میں برداشت ہر اک مصیبت کروں گا

جو دُکھ درد میں پاؤں گا میں کسی کو　　تو دور اُس کی تکلیف و آفت کروں گا
نہ رکھوں گا میں بیر دل میں کسی سے　　نہ ہرگز کسی سے عداوت کروں گا
رہیں مطمئن[۱] اور خوش ہند والے　　اسی دھن میں صرف اپنی ہمت کروں گا
نہ ننگا رہے گا کوئی اور نہ بھوکا　　مہیا[۳] وہ اسبابِ راحت کروں گا
نہ محتاج کوئی رہے گا نہ مفلس　　مروّج[۴] وہ صنعت وہ حرفت کروں گا
نہ کاہل نظر آئیں گے پھر نہ جاہل　　فنا اس طرح سے جہالت کروں گا
دبے گا ڈرے گا نہ کوئی کسی سے　　جوانوں میں پیدا وہ قوت کروں گا
بڑھاؤں گا میں حوصلے دوستوں کے　　نئے سر سے پیدا وہ جرأت کروں گا
جو بیکار ہوں گے، جو ناچار ہوں گے　　روا اُن کی ہر ایک حاجت کروں گا
ستم جو کریں گے مٹا دوں گا اُن کو　　کرم کرنے والوں کی طاعت[۵] کروں گا
میں پیارا وطن کا ہوں یہ مجھ کو پیارا　　ہر اک اس کی پوری ضرورت کروں گا
بچاؤں گا برباد ہونے سے اس کو　　خدا چاہے تو دور ذلت کروں گا
غلامی سے آزاد کرنا ہے اس کو　　جو کچھ مجھ سے ممکن ہے جرأت کروں گا
کروں گا زمانے میں نام اس کا روشن　　بلند اس کی دنیا میں عظمت[۶] کروں گا

بنوں گا میں زینت اس اجڑے چمن کی
جب اس ہند کو رشکِ جنت کروں گا

---

۱ اطمینان سے۔ ۲ خوش اور آرام سے ۳ تیار ۴ رواج دوں گا۔

۵ فرمانبرداری۔ کہا ماننا ۶ بزرگی بڑائی۔

رزائی

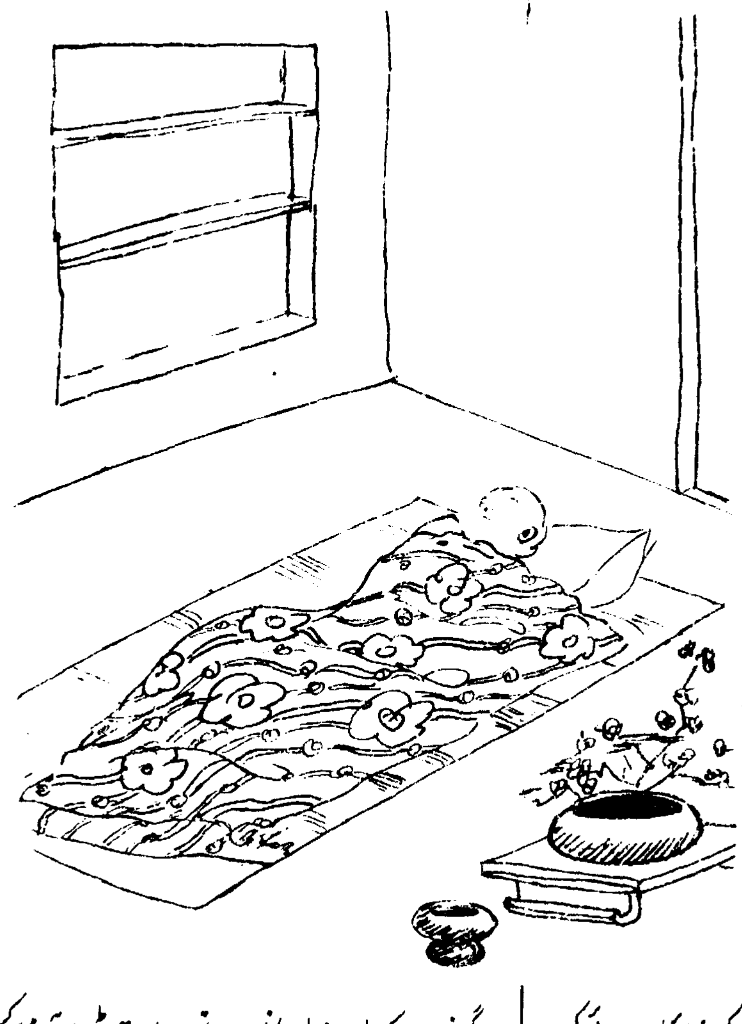
حامد حسین صاحب متعلم جامعہ دہلی

(ایک جاپانی کہانی)

سرائے کے کھلے دروازے سے ایک سوداگر کو اندر آتے دیکھ کر جاپانی سرائے والے نے بلند آواز سے کہا :۔

"آیئے جناب، اندر آیئے آپ کا آنا میرے لئے باعث برکت ہے۔"

یہ ایک چھوٹی سی سرائے تھی اور اتفاق سے اسی دن کھلی تھی۔ میزبان یا سرائے کا مالک غریب آدمی تھا۔ اس نے چٹائیاں۔ میزیں، برتن اور دوسری مختلف چیزیں پرانی خرید لی تھیں۔ لیکن یہ سب تھیں صاف ستھری۔ اس لئے سوداگر نے اس جگہ کو پسند کیا اور رات کو مزے دار کھانا کھا کر سونے کے لئے ایک کمرے میں چلا گیا۔ اس نئی سرائے میں یہ پہلا مسافر تھا۔



جاپان میں لوگ بچھونا نہیں بچھاتے چٹائیوں پر لیٹ جاتے ہیں اور اوپر سے کچھ اوڑھ لیتے ہیں۔ ان کی رزائیاں روئی کی ہوتی ہیں۔ امیر آدمی بہت اچھی اچھی رزائیاں اوڑھتا ہے مگر غریب کے پاس زیادہ نہیں ہوتیں۔ بہت بڑے آدمی کے

پاس آٹھ فٹ لمبی اور سات فٹ چوڑی رزائیاں ہوتی ہیں۔ دن کو یہ الماریوں میں رکھ دی جاتی ہیں۔ الماریوں پر رنگین پردے پڑے ہوتے ہیں۔ ان میں لکڑی کے تکیے بھی رکھے ہوتے ہیں۔ جن پر جاپانی لوگ سوتے وقت اپنے سر اس طرح رکھتے ہیں کہ کالے کالے بالوں کی لٹیں اور گھونگھر نہ بگڑنے پائیں۔ تکیہ زمین پر گر پڑے تو جاپانی اسے اپنے پاؤں سے نہیں چھوتا۔ اگر دھوکے سے تکیے میں پاؤں لگ جائے تو اس کو اٹھا لیتا ہے اور اپنی پیشانی سے لگا کر کہتا ہے "میں معافی چاہتا ہوں۔"

خیر سوداگر اپنے کمرے میں جاکر تھوڑی ہی دیر سویا تھا کہ اسے آوازوں نے جگا دیا۔ یہ دو لڑکوں کی آوازیں تھیں۔

ایک نے کہا "پیارے بڑے بھائی کیا تمھیں سردی لگتی ہے؟"

دوسرے نے کہا۔ "اور کیا تمھیں بھی سردی لگتی ہے؟"

سوداگر نے خیال کیا کہ شاید سرائے والے کے لڑکے غلطی سے اس کمرے میں آگئے ہیں اور یہ ان کے لئے آسان بھی تھا۔ کیوں کہ جاپانیوں کے کمروں کے بیچ میں دروازے نہیں ہوتے جو بند کرلئے جائیں۔ صرف کاغذ کی دیواریں ہوتی ہیں جو ادھر ادھر سرکائی جاسکتی ہیں۔

"ہونھ، ہونھ" سوداگر بولا۔ "بچو یہ تمھارا کمرہ نہیں ہے۔"

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد پھر وہی آوازیں سننے میں آئیں:۔

"پیارے بھیا کیا ......"

"اور کیا تم کو ......"

مہمان اپنے بستر سے اٹھا اور ایک موم بتی سلگائی۔ جو جاپانیوں کی کاغذی لالٹین میں لگی ہوتی ہے اس نے کمرے میں چاروں طرف دیکھا۔ کچھ دکھائی نہ دیا الماریوں میں جھانکا۔ وہاں بھی کچھ نظر نہ آیا۔ آخر موم بتی کو جلتا چھوڑ کر لیٹ گیا۔ پھر دوبارہ آوازیں آئیں۔

"بھائی کیا تم ......"

"اور کیا تم کو ......"

آوازیں انھی رزائیوں سے آرہی تھیں۔ اب اسے یقین آچلا کہ رزائیوں ہی سے آرہی تھیں۔ جلدی جلدی اس نے اپنی سب چیزیں اکٹھا کیں۔ سامان باندھا نیچے اترا سیدھا سرائے کے مالک کے پاس گیا اور جو کچھ گذرا تھا کہہ سنایا۔

سرائے والے نے غصے سے بھری ہوئی آواز میں کہا "جناب عالی آپ نے کھانے کے ساتھ شراب بہت سی پی لی ہے۔ اس سے بڑے بڑے خواب نظر آرہے ہیں میری رزائی بات نہیں کرتی نا۔"

"ان میں سے ایک ضرور بولتی ہے" سوداگر نے جواب دیا اور جب تم مجھ سے اس طرح سختی کے ساتھ بات چیت کر رہے ہو تو میں زیادہ یہاں نہیں ٹھہر سکتا لو اپنا کرایہ میں جاتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

دوسری رات ایک اور مہمان آیا۔ کھانے کے بعد اس نے کچھ زیادہ شراب بھی نہیں پی۔ لیکن سونے کے کمرے میں گئے ہوئے اسے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ وہ بھی

نیچے اُترا اور سرائے والے سے شکایت کی کہ رزائی میں سے دو آوازیں آتی ہیں..........

"پیارے بڑے بھائی کیا تم کو........

اور کیا تم کو بھی........"

"جناب" مالک مکان نے چلا کر کہا "میں نے انتہائی کوشش کی کہ آپ کو آرام ملے۔ اب آپ کو کیا حق ہے کہ مجھے بے کار قصوں سے پریشان کریں۔

"واقعی عجیب بات ہے۔ مہمان نے جواب دیا" یہ کوئی فضول بات نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ میں نے دو بچوں کی آوازیں رزائی سے سنی ہیں۔ میں اس گھر میں نہیں ٹھہر سکتا۔

جب دوسرا مہمان بھی چلا گیا تو مالک اوپر آیا اور ایک ایک کرکے رزائیاں الٹیں، پلٹیں۔ اس نے بھی کسی ایک رزائی سے یہی آوازیں سنیں:۔

"بھائی جان کیا........"

"اور کیا تم کو........"

آخر وہ آوازوں والی رزائی لے جاکر خود اس پر لیٹ گیا۔ تمام رات لڑکے ایک دوسرے سے یہی پوچھتے رہے۔ جب صبح ہوئی تو مالک سیدھا کباڑی کے پاس پہنچا اور اس سے کہا:۔

"تم کو یاد ہے کہ تم نے میرے ہاتھ ایک رزائی بیچی تھی؟"

"ہاں"

"وہ تمھیں کہاں سے ملی تھی"

"ایک چھوٹے دُکان دار سے جس کی دُکان شہر کے سرے پر ہے۔"

یہ سنتے ہی سرائے والا سیدھا اس دوکان دار کے پاس دوڑا۔ وہاں سے ایک اور کے پاس۔ اسی طرح چکر کھانے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ رزائی ایک چھوٹے سے مکان کے مالک نے بیچی تھی جو پیچھے کی گلی میں رہتا تھا۔

اس گھر میں ایک مختصر سا خاندان تھا...... باپ ماں اور دو لڑکے...... باپ کی آمدنی بہت کم تھی ماں اپنی بیماری کی وجہ سے اس کو کچھ مدد نہ دے سکتی تھی لڑکوں میں بڑا آٹھ برس کا اور چھوٹا چھ کا تھا۔ سردیوں میں باپ بیمار پڑا۔ ایک ہفتے کی تکلیف کے بعد اس نے انتقال کیا اور دفن کر دیا گیا۔ ماں بھی مر گئی۔ اب دونوں بھائی گھر میں اکیلے رہتے تھے اُن کا کوئی رشتہ دار نہ تھا۔ فاقہ پر فاقہ ہونے لگا۔ انھوں نے کھانا خریدنے کے لئے پہلے ایک چیز بیچی۔ پھر دوسری، پھر تیسری۔ آخرکار ایک رزائی کے سوائے اُن کے پاس کچھ باقی نہ رہا۔ باہر برف نہایت شدت سے پڑ رہی تھی۔ دونوں بھائی ایک ہی رزائی میں لپٹ گئے اور چھوٹے نے کہا۔

"پیارے بڑے بھائی کیا تم کو سردی لگتی ہے؟"

بڑے نے جواب دیا

"کیا تم کو بھی سردی لگتی ہے؟"

یہ آوازیں قدرت سے اس رزائی میں سمو گئیں اور گونجتی رہیں۔

جس مکان میں یہ بچے رہتے تھے اُن کا مالک ایک روز بڑے غصے میں مکان میں داخل ہوا۔ اس نے لڑکوں کو سوتے سے جگا دیا۔ اور بگڑ کر کہا:۔

"کرایہ کہاں ہے؟"

"جناب ہمارے پاس دام نہیں"

"اچھا نکل جاؤ۔ میں اس رزائی کو کرائے کی مد میں رکھتا ہوں"

"جناب برف بہت پڑ رہی ہے"

"نکلو!"



آخر کار دونوں بھائی مجبور ہو کر باہر چلے گئے۔ دونوں صرف ایک ایک نیلی قمیص پہنے ہوئے تھے ان کے اور کپڑے کھانے کی نذر ہو چکے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے مل کر اسی گھر کے پیچھے جہاں سے ان کو بھگا دیا گیا تھا برف میں لیٹ گئے۔ برف کے پرت ان پر گرتے رہے۔ نرم چمکیلے اور صاف، سردی غضب کی تھی اور پھر برف پڑ رہی تھی۔ وہ بے چارے سو گئے۔ ایسے بے خبر کہ اب قیامت ہی کو اٹھیں گے۔ یہ موت کی نیند تھی۔ ایک آدمی ادھر سے گذرا وہ ان معصوموں کے بے روح جسم رحم کی دیوی کے مندر میں گاڑ آیا۔ جس کا نام کوآنن تھا۔

جاپانی مندروں میں تم ایک خوب صورت مہربان عورت کا چہرہ پاؤ گے۔ اس کے ہزار ہاتھ ہوں گے یہی کوآنن کی مورتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس عورت نے اپنے عیش و آرام کے لئے جنت کا دروازہ کھلا پایا۔ لیکن وہ داخل نہ ہوئی۔ اس نے دنیا کی سیکڑوں ہزاروں اور کروڑوں، روحوں کا خیال کیا۔ جو دُکھ بیماری اور رنج میں مبتلا تھیں۔ اس نے کہا: میں ان کے ساتھ ٹھہرنا پسند کرتی ہوں جنت میں نہ جاؤں گی اور اپنے بہت سے ہاتھوں سے اُن کی مدد کروں گی۔"

وہ دونوں بھائی اسی رحم کی دیوی کے گھر کے سائے میں دفن کر دئے گئے۔ ایک دن مالک سرائے نے لوگوں کو مندر میں بلایا۔ اور ان آوازوں کا سب قصہ کہہ سنایا۔ رزائی پجاری کو دے دی۔ سرائے والے کا دل اور اُن سب کے دل جنھوں نے یہ قصہ سُنا مردہ بچوں کے لئے رحم سے بھر گئے۔

رزائی پھر نہ بولی۔ کیوں کہ اس نے اپنا فرض ادا کر دیا تھا۔ اپنا پیغام پہنچا دیا تھا۔ اس نے لوگوں کو شرمندہ کر دیا تھا۔ کہ دیکھو کس طرح چھوٹے چھوٹے بچے اُن کے ملک میں سردی اور بھوک سے مر گئے۔ اور تم نے خبر نہ لی۔

بہت سی محتاج اور بے کس روحیں ایک دوسرے سے کہتی ہیں "

"پیارے بڑے بھائی کیا تم کو سردی لگی ہے"

"اور کیا تم کو سردی لگی ہے"

مسلمان بچہ

از جناب فضل آغا مظفری

فطرت عظیم آبادی

میں خدا کے یہاں سے آیا ہوں — زندگی کا پیام لایا ہوں
زندہ وہ ہے سدا جو بڑھتا ہے — زندگی نام ہی نمو[1] کا ہے
مجھ کو بڑھنا ہے، مجھ کو بڑھنا ہے — اوج[2] نشو و نما پہ چڑھنا ہے!
پھولنا اور مجھ کو پھلنا ہے — شجر[3] میوہ دار بننا ہے!

میں مسلماں ہوں میں مسلماں ہوں

علم کے نور میں بڑھوں گا میں — روشنی ہر جگہ کروں گا میں
علم دولت ہے علم دولت ہے! — علم سے زندگی کی زینت ہے
جگمگا جائے یہ جہان خراب — علم کے موتیوں میں ہے وہ آب
موتی یہ جس جگہ بھی پاؤں گا! — چین ہو یا فرنگ لاؤں گا!

میں مسلماں ہوں میں مسلماں ہوں

راست بازی ہے میری طینت میں — رحم و انصاف میری فطرت میں
کفر و الحاد سے لڑوں گا میں — ظلم و بیداد سے لڑوں گا میں
دل میں اقرار ہے سچائی کا — سر میں انکار ہے برائی کا!

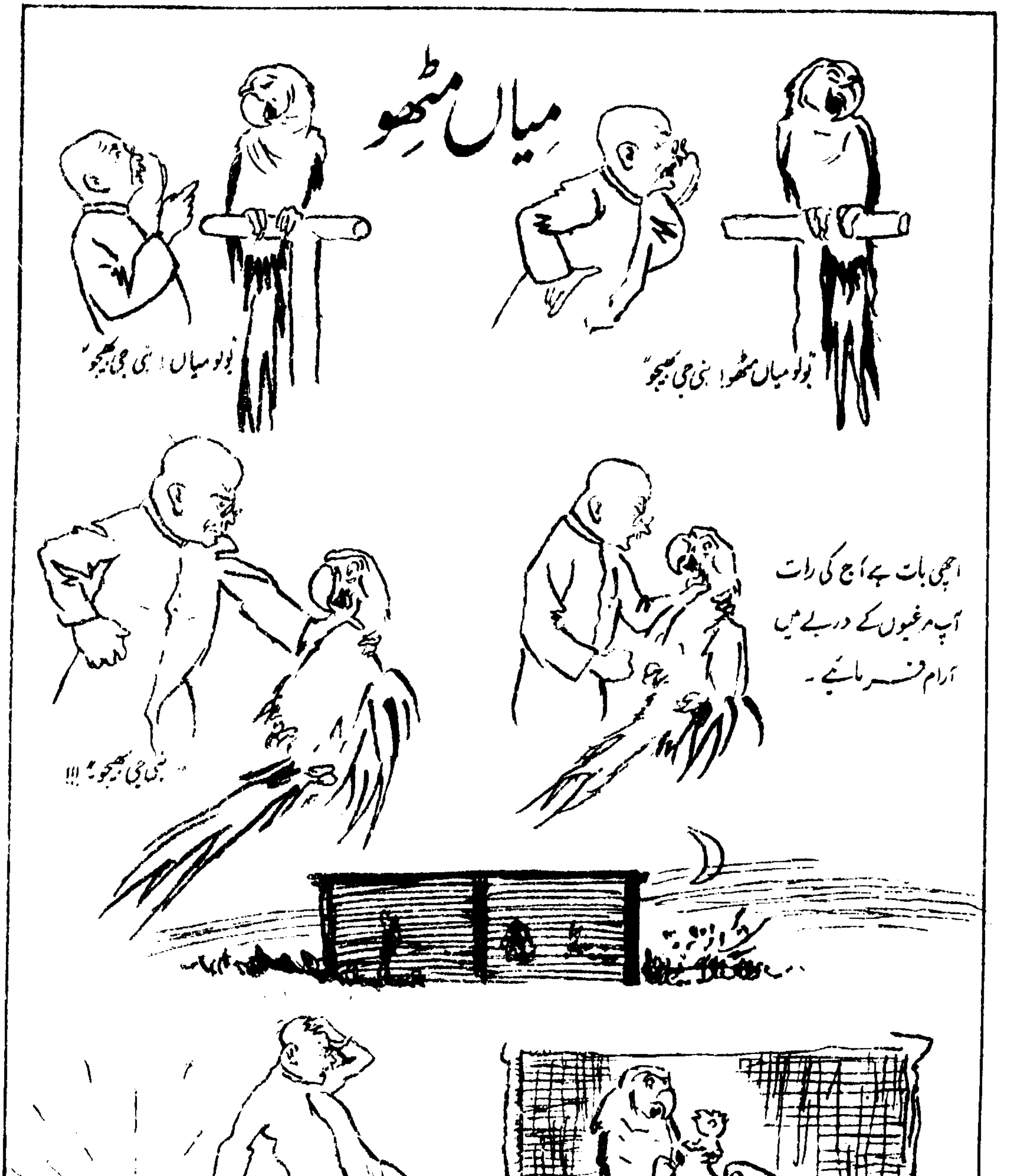
میں مسلماں ہوں میں مسلماں ہوں

زندہ وہ ہے جو کام کرتا ہے — قوم کا اپنے نام کرتا ہے
قوم کا مجھ کو کام کرنا ہے — اس پہ جینا ہے اس پہ مرنا ہے
قوم کے واسطے جیوں گا میں — قوم کے واسطے مروں گا میں!

میں مسلماں ہوں میں مسلماں ہوں

---

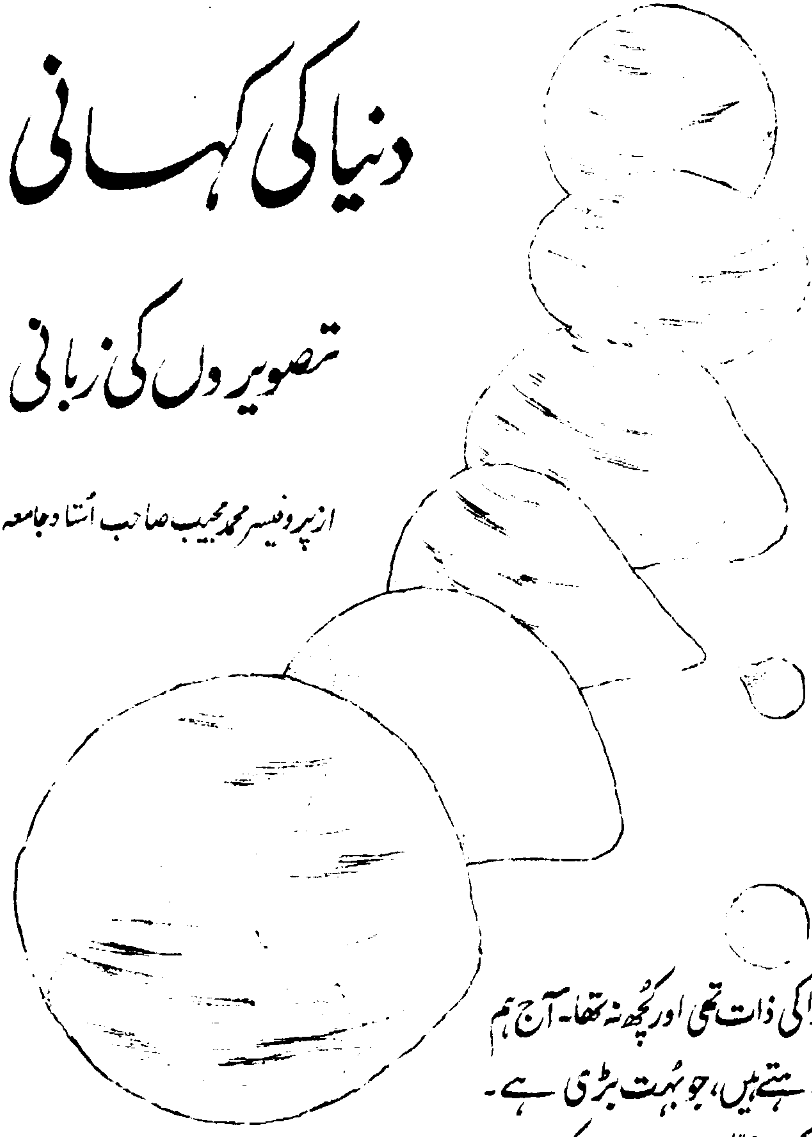
۱ بڑھنا ۲ بلندی ۳ درخت


میاں مٹھو
"بولو میاں مٹھو! نبی جی بھیجو"
"بولو میاں! نبی جی بھیجو"
اچھی بات ہے آج کی رات
آپ مرغیوں کے دربے میں
آرام فرمائیے۔
"نبی جی بھیجو"!!!
"بولو میاں مٹھو! نبی جی بھیجو"

دنیا کی کہانی

تصویروں کی زبانی

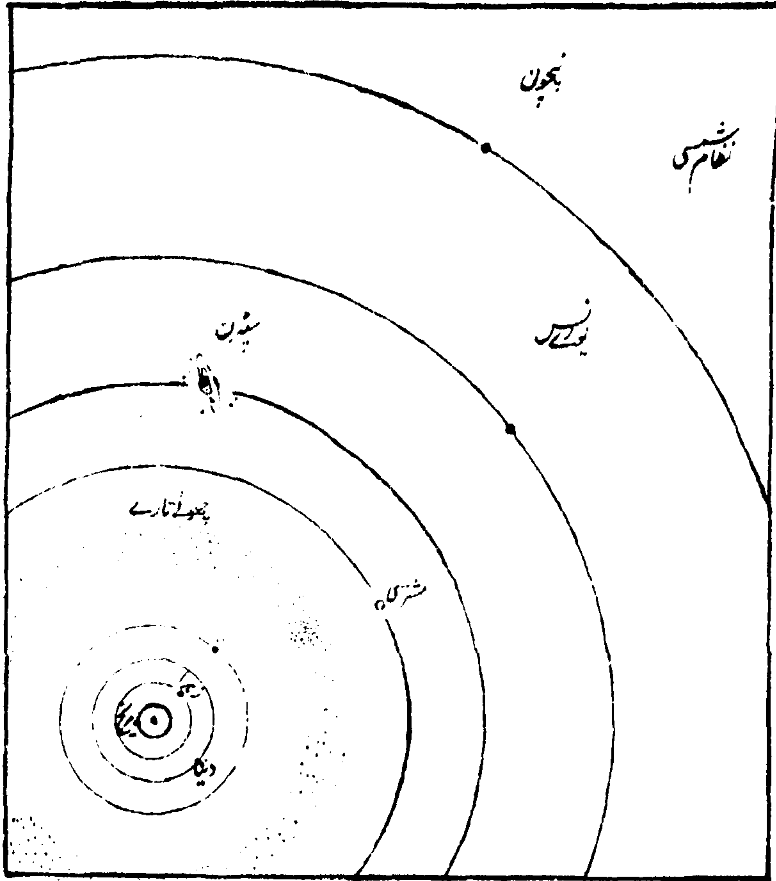
از پروفیسر محمد مجیب صاحب اُستاد جامعہ



(۱)

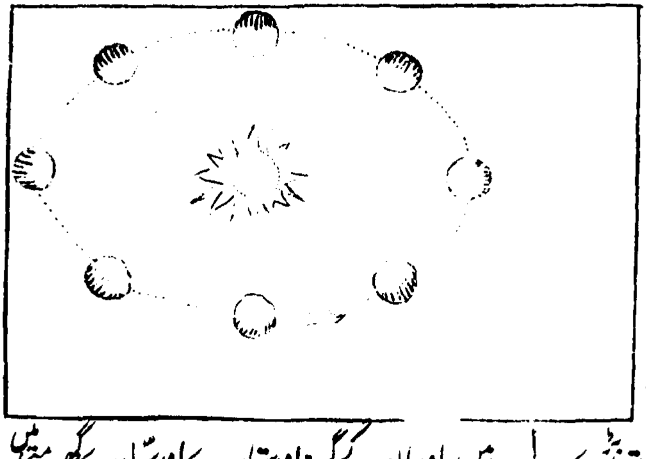
پہلے خدا کی ذات تھی اور کچھ نہ تھا۔ آج ہم ایک دنیا میں رہتے ہیں، جو بہت بڑی ہے۔ مگر کائنات کا ایک ذرّہ ہے۔ خدا کی قدرت دیکھو کہ اُس نے ہماری دنیا اور یہ کائنات کیسے بنائی۔ (تصویر نمبر ۱)

ہماری دنیا ایک گولہ ہے جو اپنے سے

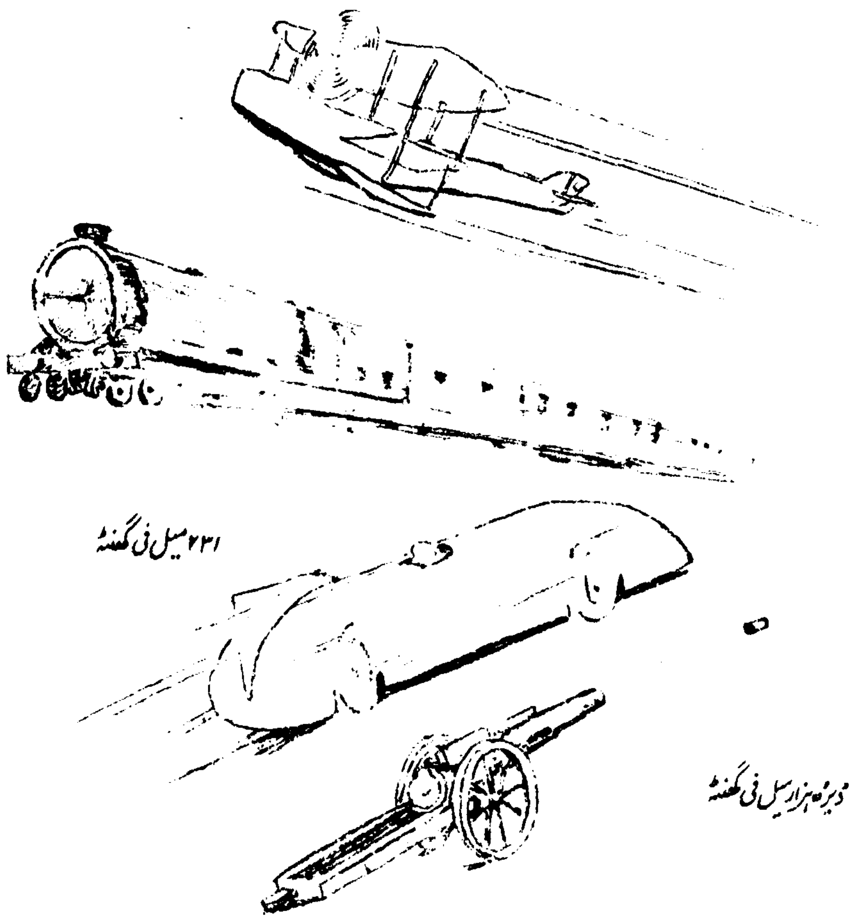


(۲)

بہت زیادہ بڑے گولے کے گرد چکر لگاتا ہے۔ پہلے یہ بڑا گولا ہی تھا، جو اتنی تیزی سے گھوم رہا تھا کہ میں اُسے بیان بھی کردوں تو تم سمجھوگے نہیں۔ پھر اس گولے کا ذرا سا حصہ ٹوٹ کر الگ ہوگیا۔ جیسے تم اس تصویر میں دیکھتے ہو۔ پھر ایک اور الگ ہوا اور پھر ایک اور۔ بڑا گولا ہمارا سورج ہے، چھوٹے گولے ہماری دنیا مریخ، مشتری، زہرا اور بہت سے اور ستارے جو سورج کے گرد گھومتے ہیں اور سب ملا کر نظام شمسی کہلاتے ہیں۔ (تصویر ۲، ۲الف) لیکن ہماری سورج کی طرح اور بہت سے سورج ہیں جو اس سے بہت بڑے ہیں، اور ان کے گرد اور ستارے اور سیارے گھومتے ہیں



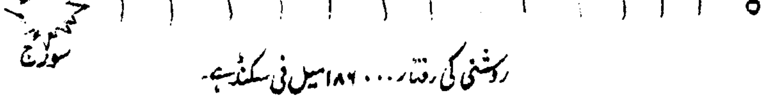
(۲الف)





(۳)

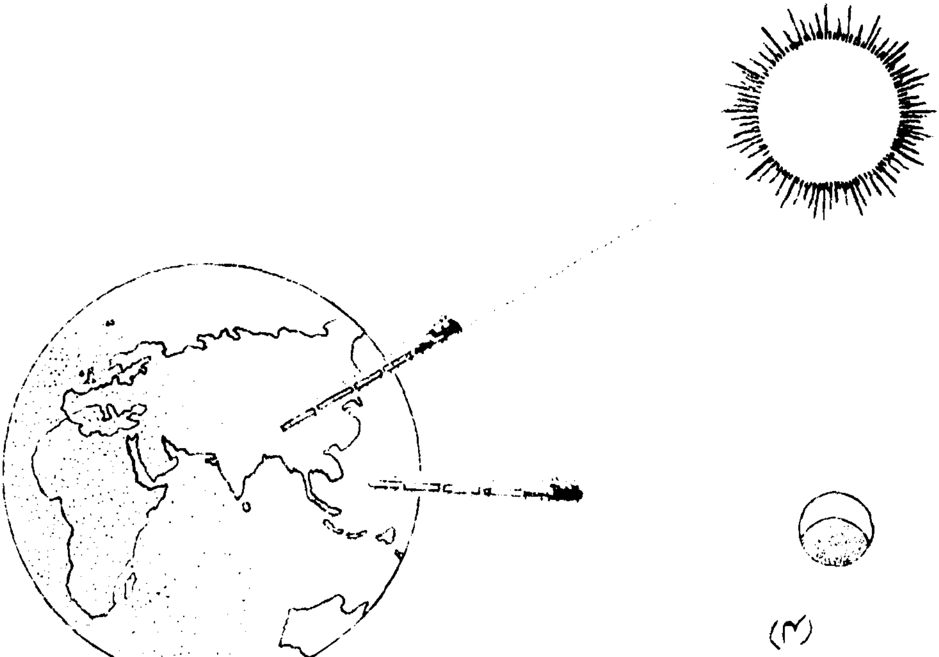
سورج کی دنیا تک روشنی ۹ منٹ میں پہنچتی ہے۔



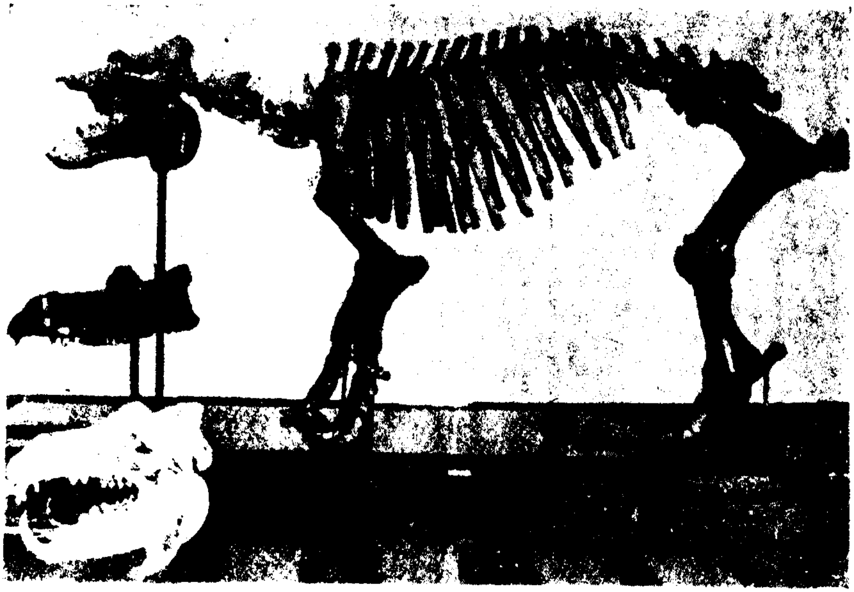
روشنی کی رفتار ۱۸۶۰۰۰ میل فی سکنڈ ہے۔

ہم نے ریل بنائی اور سمجھے کہ وہ بہت تیز چلتی ہے، پھر ایسے موٹر بنائے جو ۲۳۱ میل فی گھنٹہ چل سکتے ہیں ہوائی جہاز سے ان تیز موٹروں کی دوڑ ہو تو موٹر ایک گھنٹے میں سوا سو میل پیچھے رہ جائیں گے۔ تم سمجھتے ہو کہ توپ کا گولہ بہت تیز جاتا ہوگا۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ وہ بہت تیز جاتا ہے، مگر کیا، حساب لگاؤ تو وہ بھی کوئی ڈیڑھ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جاتا ہے۔ اور ادھر دنیا کو دیکھو، کہ اتنی بڑی ہے، اور پھر بھی سورج کے گرد گھومتے ہوئے آٹھ لاکھ میل روزانہ طے کرتی ہے یعنی توپ کے گولے سے اس کی رفتار دوگنی ہے۔ اور اسی طرح لاکھوں کروڑوں برس سے گھوم رہی ہے۔ اور روشنی کا کیا پوچھنا، وہ تو ایک سکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل جاتی ہے۔ اس پر اسے سورج سے یہاں تک پہنچنے میں نو منٹ لگتے ہیں، ذرا حساب تو لگاؤ، سورج ہماری دنیا سے کتنی دور ہے۔ (تصویر ۴)

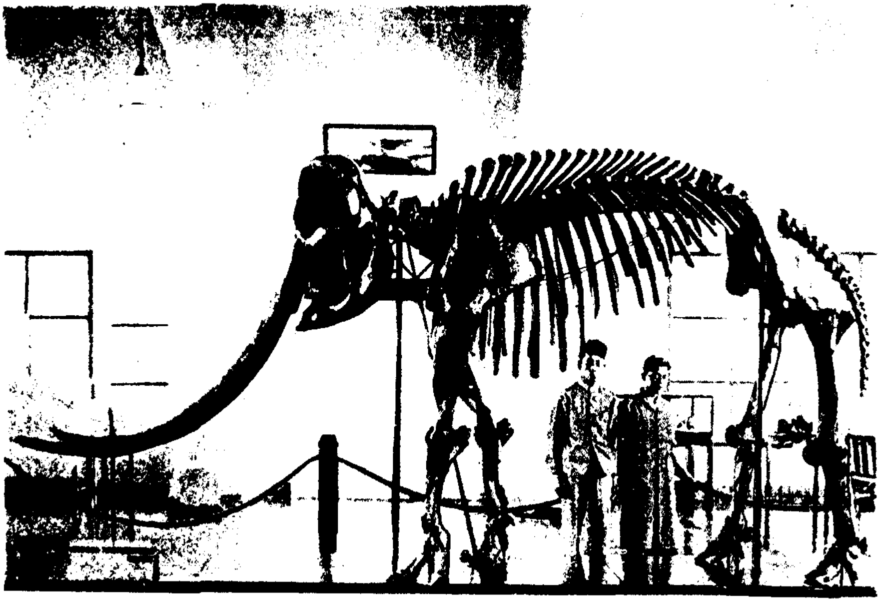
اگر تم ریل سے چاند تک جانا چاہو اور دن رات ۵۰ میل فی گھنٹے کی رفتار سے سفر کرو تو تمہیں چاند تک پہنچنے میں چھ مہینے لگیں گے۔ سورج تک



(۴)

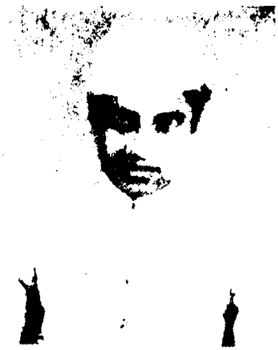


[illegible] پرانے جانور کا ڈھانچہ [illegible]



کئی ہزار سال پہلے کے ایک جانور کا ڈھانچہ جس کی شکل آج کل کے ہاتھی [illegible]
[illegible]

ہمارے چند مضمون نگار



سید ابو محمد داؤد صاحب



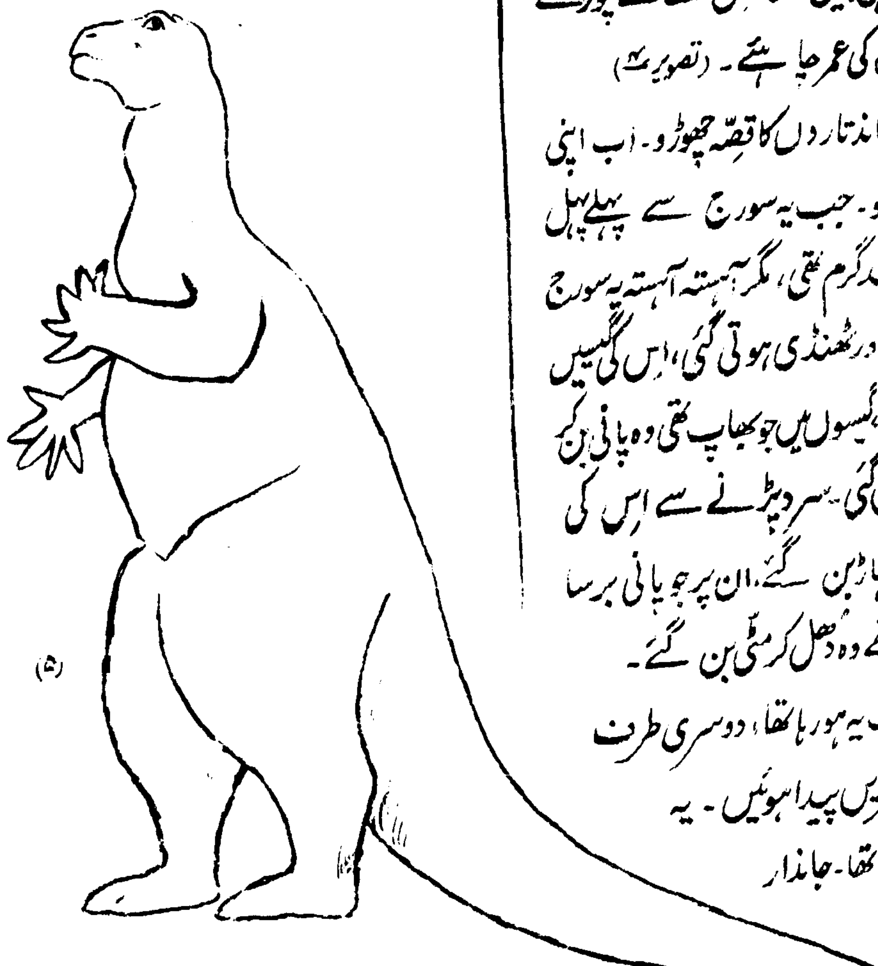
ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب
پی ایچ ڈی



امتیاز حسین خاں صاحب بی اے جامعہ (لندن)

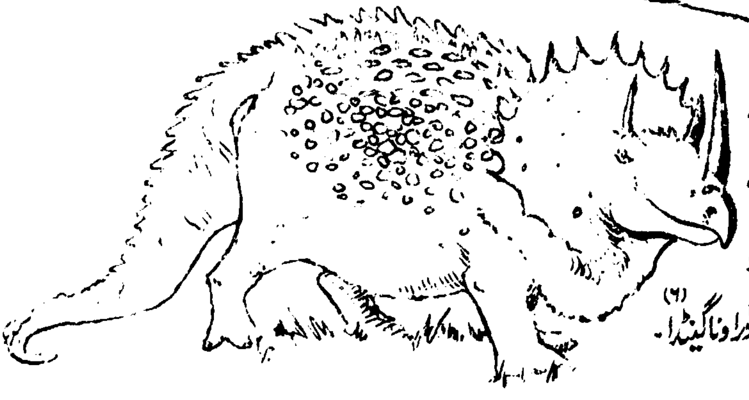
کوئی زندہ پہنچ ہی نہیں سکتا، اس کے لئے پورے دو سو دس برس کی عمر چاہیے۔ (تصویر ۴)

خیر! چاند تاروں کا قصہ چھوڑو۔ اب اپنی دنیا کی کہانی سنو۔ جب یہ سورج سے پہلے پہل الگ ہوئی تو بیحد گرم تھی، مگر آہستہ آہستہ یہ سورج سے زیادہ دور اور ٹھنڈی ہوتی گئی، اس کی گیسیں جم کر ٹھوس ہوگئیں، گیسوں میں جو بھاپ تھی وہ پانی بن کر برسی اور سمندر بن گئی۔ سرد پڑنے سے اس کی سطح جو سکڑی تو پہاڑ بن گئے۔ ان پر جو پانی برسا تو جو پتھر ذرا نرم تھے وہ دھل کر مٹی بن گئے۔



(۵)

ایک طرف یہ ہو رہا تھا، دوسری طرف پانی میں جاندار چیزیں پیدا ہوئیں۔ یہ قدرت کا نیا کرشمہ تھا۔ جاندار چیزیں پہلے اتنی چھوٹی تھیں کہ تم انھیں دیکھ نہ سکتے پھر بڑھتے بڑھتے طرح طرح کے اژدہے اور بھیانک جانور بن گئیں۔ یہ دیکھو (۵) دیو کے برابر ایک بچھکوڑ ہے (۶) اور یہ بڑا ڈراونا گینڈا۔



(۶)



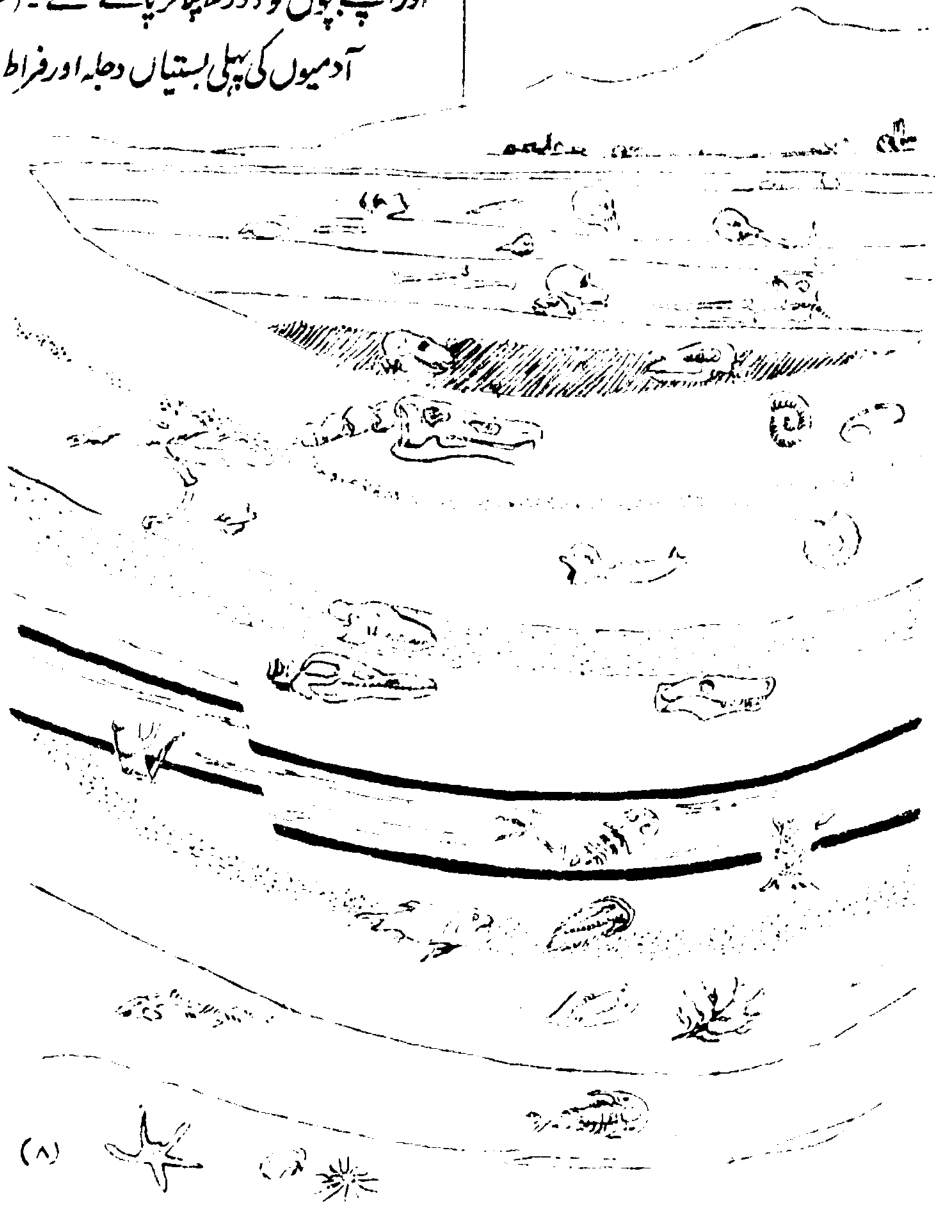


(۷)

۹ اِس کے بعد کی تصویریں اسی زمانے کے چمگادڑ ہیں۔(۷) جو آدمی سے بھی بڑے تھے، ان کے علاوہ اور بہت سے جانور تھے لیکن ہم نے اُن کی تصویریں نہیں بنائیں کہ تمھیں خواب میں کہیں ان کی ڈراونی صورتیں دکھائی نہ دیں۔ یہ سب جانور پیدا ہوئے اور مر گئے۔ اب ہم

زمین کھودتے ہیں تو ہمیں ان کی ہڈیاں ملتی ہیں، اور وہ جتنی گہرائی پر ہوں اس سے ہم اندازہ لگاتے ہیں کہ وہ کتنا زمانہ ہوا دنیا میں رہتے تھے۔ جب خدا نے انسان کو پیدا کیا تو جانور بہت چھوٹے ہو گئے تھے اور اپنے بچوں کو دودھ پلا کر پالتے تھے۔ (تصویر ۸)

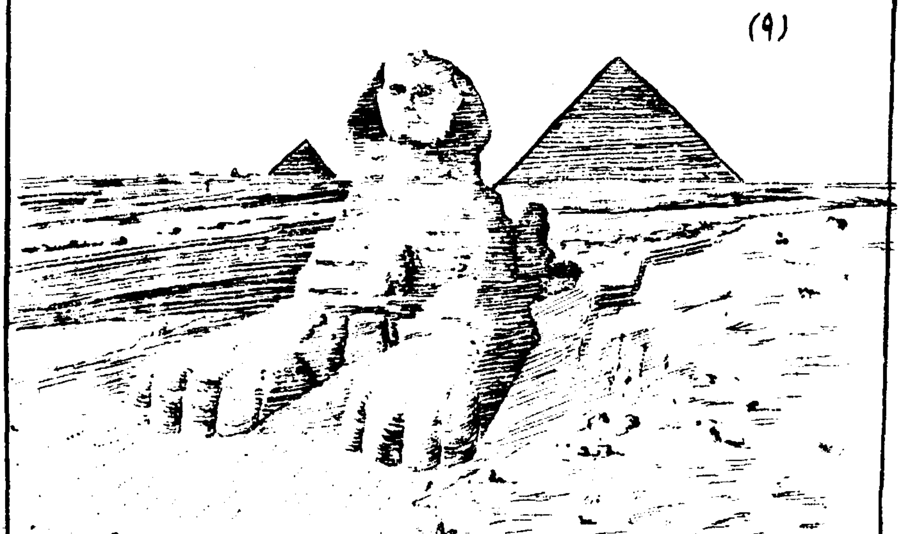
آدمیوں کی پہلی بستیاں دجلہ اور فرات نیل،



(۸)

سندھ، ہوآنگ ہو اور یانگ ٹسے کیانگ کی وادیوں میں تھیں تمھیں نہ معلوم ہو کہ دریا کہاں ہیں تو انھیں نقشے میں تلاش کر لو ہمیں اس قدیم زمانے کے لوگوں کے حالات تاریخ میں نہیں ملتے اس لئے کہ اس زمانے میں لوگ تاریخیں لکھتے نہیں تھے۔ لیکن یہ لوگ اپنی یادگاریں چھوڑ گئے ہیں جن سے ہمیں اُن کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو جاتا ہے۔ آؤ تمھیں ان کی سیر کرائیں۔

یہ تصویریں مصر کی ہیں۔ تصویر نمبر ۹ میں سامنے ایک عجیب سی شکل کی مورت ہے جس کا سر آدمی کا اور دھڑ شیر کا ہے۔ ہم ٹھیک ٹھیک نہیں بتا سکتے کہ یہ کیا ہے، مگر خیال ہے کہ یہ کسی دیوتا کی مورت ہے۔ یہ مورت ایک چٹان کو چھیل کر برسوں میں اور بڑی محنت سے بنائی گئی اس کے پیچھے جو مثلث کی شکل کی عمارتیں ہیں وہ اہرام مصر کہلاتی ہیں، یہ کئی سو فٹ اونچی اور بھاری تراشے ہوئے پتھروں کی بنی ہیں۔ ان کے اندر مصری بادشاہوں کے تابوت ملے ہیں۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ مقبرے تھے۔ اس کے بعد کی تصویر میں ایک بہت پرانے


(۹)

مندر کے ستون ہیں جن پر پہلے رنگ پھرا تھا اور تصویریں بنی تھیں۔ اس زمانے میں لوگ بڑے خوبصورت مکان اور عبادت خانے بھی بنا سکتے تھے۔

اب اور آگے بڑھو۔ یہ تصویر بابل کے ایک بہت مشہور باغ کی ہے جسے ایک ملکہ نے اپنے لئے بنوایا۔ اس میں رہ بھی سکتے تھے اور سیر بھی کر سکتے تھے بابل میں اور بھی بڑی خوبصورت عمارتیں تھیں لیکن افسوس ہے وہ سب گر گئیں اور زمین میں دفن ہوگئیں۔ تصویر نمبر ۱۱

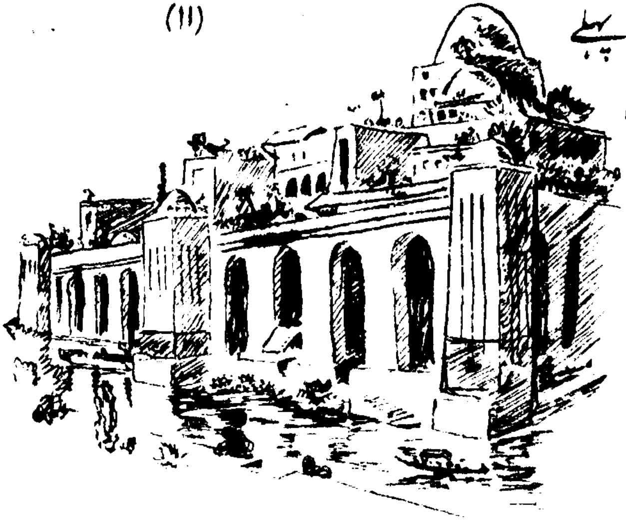


(۱۰)

تصویر نمبر ۱۲ اور ۱۳

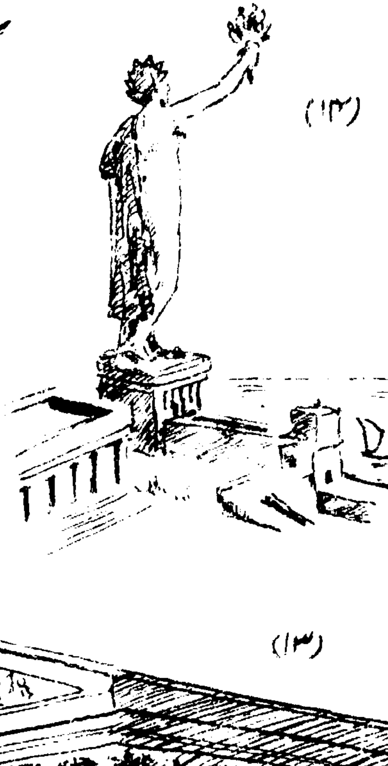
یہ دونوں تصویریں یونان کی ہیں۔ دائیں طرف یونان کے سب سے بڑے دیوتا کی مورت ہے، جو چالیس فٹ اونچی اور سنگِ مرمر اور سونے کی تھی۔ بائیں طرف ایک نہایت حسین مندر ہے

(۱۱)



جس پر اسی قسم کے ستون ہیں جو تم نے پہلے مصر کے مندر میں دیکھے تھے۔ مگر یہ ستون زیادہ سڈول ہیں۔ اور پوری عمارت زیادہ خوشنما۔

(۱۴)



(۱۲)

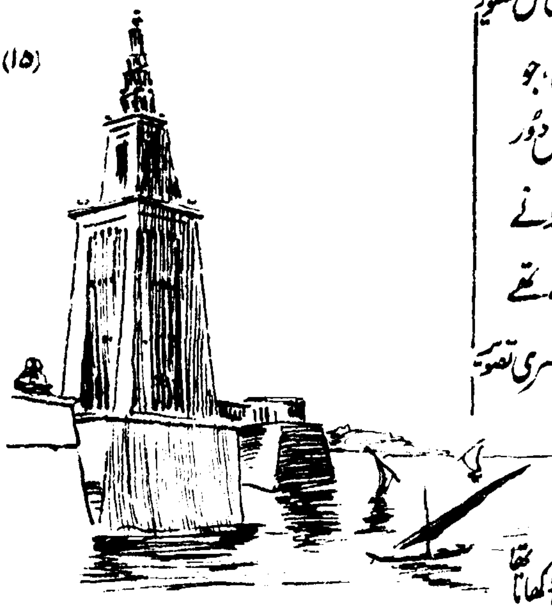


(۱۳)



یہ بڑی آدمی کی مورت جس کے ہاتھ میں مشعل (تصویر ۱۴) ہے سمندر کے تاجروں کی ایک قوم نے بنائی، جو بحرِ روم کے جزیرے کریٹ میں آباد تھی۔ یہ میلوں دُور سے دکھائی دیتی اور جہازرانوں کو گھر کے قریب ہونے کی خوشخبری سناتی تھی۔ اب آدمی اتنی ترقی کر چکے تھے کہ اپنی ہمت اور حوصلے پر ناز کر سکتے تھے۔ دوسری تصویر (۱۵) سنگ مرمر کے ایک مینار کی ہے جو اسکندریہ (مصر) کی بندرگاہ میں بنا ہوا تھا اور جہازوں کو راستہ دکھاتا تھا۔

(۱۵)



اخلاقی پیام

بچے سے گفتگو ہو، بوڑھے سے یا جواں سے
تہذیب اور ادب کے موتی جھڑیں زباں سے
شیریں زبان بن کر مشکل نہیں ہے کچھ بھی
دشمن کو دوست کرنا آسان ہے زباں سے

جو با اثر نہ ہو، یا جس کا اثر بُرا ہو
ایسی نہ بات کوئی نکلے کبھی زباں سے
راضی ہی اُن کو رکھنا۔ ناراض ہو گئے تو
پھر اپنے دوستوں کو لاؤ گے تم کہاں سے

(خاور جبلپوری)

دلچسپ مشغلے

(از حمیدہ اختر صاحبہ حیدر آباد دکن)

سچ کہنا ٹکٹ جمع کرنے کا کیسا دلچسپ مشغلہ تمھیں بتایا گیا ہے۔ تم میں سے بہت سے شوقین بچے سال بھر سے بڑی محنت اور شوق کے ساتھ ٹکٹ جمع کر رہے ہیں۔ اس تھوڑے سے عرصے ہی میں تمھارے پاس اچھی خاصی تعداد میں ٹکٹ جمع بھی ہو گئے۔ پیام تعلیم میں تمھاری خط کتابت پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شوق بچوں میں دن بدن بڑھ رہا ہے۔

اسی طرح کے اور بھی بہت سے کارآمد اور دلچسپ مشغلے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ اُن کے متعلق تمھیں کچھ بھی نہیں معلوم، ولایت میں تو ایسے شوق بچوں میں بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ وہاں تمھیں بہت کم بچے ایسے ملیں گے جن کے پاس ایک دو چیزوں کے ذخیرے نہ ہوں۔ اُن کے والدین جب دیکھتے ہیں کہ اُن کے بچوں کی طبیعت کا لگاؤ اس مشغلے کی طرف زیادہ ہے۔ تو وہ بھی اُن کی خاطر اس میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں۔ اور ہر طرح اُن کی مدد کرتے ہیں۔ ولایت میں جب تمھاری عمر کے بچے اپنے دوستوں کے گھر ملنے جاتے ہیں تو پہلے وہ تھوڑی دیر آپس میں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہیں اور پھر میزبان دوست اپنے ساتھی کی خاطر اس طرح کرتے ہیں کہ اپنی جمع کی ہوئی چیزیں یا اُن کے البم اور ذخیرے دکھلانے لگ جاتے ہیں۔ پھر اُن کی باتیں اپنی اپنی دلچسپی کے متعلق ہونے لگتی ہیں۔ اس طرح سے جن بچوں

کو ایسے شوق نہیں بھی ہوتے۔ ان میں بھی ذخیرے جمع کرنے کا شوق پیدا ہو جاتا ہے۔ والدین بھی اپنے ملاقاتیوں کو اپنے بچوں کی جمع کی ہوئی چیزیں فخریہ دکھاتے ہیں۔ اور پھر وہ گھر جا کر اپنے بچوں سے اُن کا ذکر ضرور کرتے ہیں کہ آج فلاں صاحب کے یہاں ان کے بچوں کی جمع کی ہوئی چیزیں اور اُن کے البم دیکھے۔ کیا بتائیں کیسے اچھے تھے۔ یہ سنتے ہی بچہ اپنے ابّا سے بڑے اصرار سے کہتا ہے کہ آپ کی اتوار کو ہمیں اُن کے گھرلے چل کر دکھائیے۔ اس طرح سے بچوں کا شوق اور بڑھتا ہے کہ ہمارے ذخیرے بھی ایسے ہی ہو جائیں کہ ابّا دوسروں کو خوش ہو کر دکھائیں اور سب ہماری تعریف کریں۔

اسکولوں میں جیسے ایک چھوٹی سی لائبریری ہونا ضروری ہے اسی طرح ولایت میں ہر اسکول میں ایک چھوٹا سا "میوزیم" یعنی عجائب گھر بھی ضرور ہوتا ہے۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں شیشے کی سات آٹھ الماریاں! لو ہو گیا بچوں کا میوزیم۔ اس میں زیادہ تر تو بچوں کی جمع کی ہوئی چیزیں ہوتی ہیں۔ تم دل میں سوچ رہے ہو گے کہ آخر وہاں کے بچے کیا کیا چیزیں جمع کرتے ہیں۔ لو تھوڑے سے نام میں ہی بتائے دیتی ہوں اگر تم وہاں کسی اسکول کا میوزیم دیکھنے جاؤ تو یہ چیزیں قریب قریب ہر ایک اسکول کے میوزیم میں دیکھو گے۔ مختلف ملکوں کے سکے ٹکٹ۔ مختلف چڑیوں کے چھوٹے بڑے انڈے بڑی خوب صورتی اور نفاست کے ساتھ شیشے کے چھوٹے چھوٹے بکسوں میں رکھے ہوئے۔ ہر قسم کے پیڑوں اور پودوں کی پتیاں، گھونگے اور سیپیاں۔ طرح طرح کی مشہور تاریخی تصویریں اور اس قسم کی بہت سی چیزیں۔ تم کو کیا بتاؤں بعض بچے کیسی انوکھی انوکھی چیزیں جمع کرتے ہیں

جس طرح تمھارے اسکولوں میں ہوتا ہے کہ سالانہ امتحان کے بعد چھوٹے چھوٹے ڈرامے اور کھیل وغیرہ ہوتے ہیں۔ اس کے بعد انعاموں کی تقسیم اور پھر اسکول بند۔ اسی طرح ولایت میں بھی ہوتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سی نمائش بھی ہوتی ہے۔ اس میں لڑکوں اور

بچیوں کی ہاتھ کی بنی ہوئی چیزیں ہوتی ہیں۔ جیسے نقشے، ڈرائنگ، پینٹنگ، لکڑی کی بنی ہوئی چیزیں وغیرہ، ایسی نمائش تو کبھی کبھی تمھارے اسکولوں میں بھی ہوتی ہے۔ مگر وہاں جو ایک خاص چیز اور دیکھنے میں آتی ہے وہ یہی مختلف قسم کی جمع کی ہوئی چیزیں۔

ایسی نمائشوں میں بچوں کے والدین دوسرے اسکولوں کے بچے اور استاد مدعو کئے جاتے ہیں۔ سب لوگ اور خاص طور پر بچے ایسی نمائشوں کو بے حد شوق سے دیکھتے ہیں۔ ان چیزوں پر چند انعامات اور تمغے مقرر ہوتے ہیں جو کچھ تو اچھے دستکار بچوں کو دئے جاتے ہیں اور چند ان بچوں کو ملتے ہیں۔ جن کی جمع کی ہوئی چیزیں سب سے اچھی ہوتی ہیں۔

جب بڑی نمائشیں ہوتی ہیں تو استاد اپنے اپنے اسکولوں کے بچوں کی عمدہ عمدہ دستکاریاں اور جمع کئے ہوئے ذخیرے بچوں کی یا اسکول کی طرف سے بھیج دیتے ہیں۔ نیچے ایک کاغذ پر بچے کا نام، عمر سب لکھ کر لگا دیتے ہیں تاکہ انعام دیتے وقت فیصلہ کرنے میں آسانی رہے۔ ایسی بڑی نمائشیں تو ہمارے ملک میں بھی ہوتی ہیں۔ جن میں بچوں کی دستکاریاں تو اچھی اور طرح طرح کی ہوتی ہیں مگر ان کی جمع کی ہوئی چیزیں بہت ہی کم دیکھنے میں آتی ہیں اس میں تم بچوں کا کیا قصور، یہ تو ہم بڑوں اور استادوں کا فرض ہے کہ تمھیں اس قسم کی چیزوں کے متعلق دلچسپی دلائیں۔ اور جمع کرنے کے طریقے بتائیں۔

جن بچوں کو اپنے بچپن میں مختلف چیزیں جمع کرنے کا شوق رہتا ہے۔ ان کی معلومات بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے اور پھر بڑے ہو کر فائدہ مند ثابت ہوتی ہے۔ اس قسم کے ذخیرے بڑی بڑی قیمتوں پر بک بھی جاتے ہیں۔ ولایت میں والدین اور وہ لوگ جو خریدتے ہیں ان کو اپنے دیوان خانوں میں رکھتے ہیں۔ اکثر بچے جب اسکول کی تعلیم ختم کر چکتے ہیں تو.... اپنی جمع کی ہوئی چیزیں تحفے کے طور پر اپنے اسکول کے میوزیم کو پیش کر دیتے ہیں ان

سے اُن کے استاد بہت خوش ہوتے ہیں اور اُن کا نام لگاکر اس کو اسکول میوزیم میں بطور یادگار فخریہ رکھتے ہیں۔

اس سلسلے میں دوسرے ملکوں میں بہت سے نادیدہ دوست بھی بن جاتے ہیں ایسے دوستوں کو انگریزی میں (PEN FRIEND) کہتے ہیں۔ اس طرح سے ایک دوسرے سے اپنی اپنی چیزوں کا مبادلہ بھی ہو جاتا ہے۔ اور کچھ تھوڑا بہت اس سلسلے میں ایک دوسرے کے ملک کے متعلق معلومات ان کے رہن سہن کے طریقے بھی معلوم ہو جاتے ہیں۔

اب کی انشاء اللہ تم کو کچھ چیزوں اور ان کے جمع کرنے طریقے بتاؤں گی۔ یہ مشغلے اتنے دلچسپ ہیں کہ تم فوراً بڑے شوق کے ساتھ ان میں لگ جاؤگے۔ ہر طرح سے میں تمھاری مدد کرنے کو تیار ہوں جو چیزیں مجھے دستیاب ہوسکیں گی اور اگر تم کو اُن کی ضرورت پڑی تو بشوق مجھ سے منگا لینا مگر اتنا تم کرو کہ اپنے ایڈیٹر صاحب کو راضی کرو کہ سال کے سال ایک نمائش اس قسم کی کریں جس میں تم اپنے اپنے البم ذخیرے وغیرہ بھیجو اور انعام حاصل کرو۔

ایک عجوبہ

پیام بھائیو! آؤ تمھیں ایک نہایت دلچسپ کھیل دکھائیں۔ دیکھو کتنی معمولی معمولی چیزیں ہیں جن سے ایسا عجیب وغریب تماشا تیار ہوتا ہے ایک صاف ستھری شیشے کی بوتل۔ ایک ننھی سی سوئی اور کافور کا ذرا سا ٹکڑا......

اور پھر کتنا آسان طریقہ۔ بوتل تو تمھارے گھر میں ہوگی ہی اور اس میں کارک بھی لگی ہوگی۔ اپنی آپا سے ایک سوئی لے لو اور کوئی ایک پیسہ خرچ ہوگا۔ اس کا ذرا سا کافور بازار سے لاؤ۔

پہلے سوئی کے ناک والے حصے کو کارک میں اور اس کے باریک حصے کو کافور کے ٹکڑے میں چبھو دو اور بوتل کو کارک سے بند کر دو۔ سمجھ گئے نا؟ کافور سوئی میں اٹکا ہوا بوتل کے اندر لٹکا رہے گا۔ اب بوتل کو دھوپ میں لے جاکر رکھ دو بس تمھارا کام ختم ہوگیا۔ اب تماشا دیکھنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ ارے وہ دیکھو اُدھر! چکیلے چکیلے تاگے بوتل میں کہاں سے آگئے؟ یہ سب اسی کافور کے اثر سے پیدا ہو رہے ہیں ذرا ٹھہرو۔ ابھی اسی قسم کے تاگوں سے تمام بوتل بھر جائے گی،

اہاہا! اب دیکھو ذرا! یہ دھاگے سورج کی روشنی میں کیسے چمک رہے ہیں۔ آسمان پر قوس قزح اُگ آئی ہے، واہ! واہ!! کیسے کیسے پیارے رنگ ہیں۔

ننگا پربت

سید احسن صاحب - ایم اے

ننگا پربت پر چڑھنے کی کوشش سب سے پہلے سنہ ۱۸۹۵ء میں کی گئی۔ مگر اس مہم کے لوگ زیادہ بلندی (اونچائی) تک نہ پہنچ سکے اور موسمی خرابی کی وجہ سے راستہ ہی میں ختم ہوگئے۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۳۶ء میں جرمنی اور امریکن پارٹی نے اس پہاڑ کی چوٹی پر پہنچنے کا ارادہ کیا مگر وہ بھی ۲۳ ہزار فٹ سے آگے نہ بڑھ سکے۔ موسم کی ناہمواری اور باربرداروں کی ناطاقتی کے سبب اس پارٹی کو بھی منزلِ مقصود[1] تک پہنچنے سے پہلے واپس ہونا پڑا۔ اس مضمون میں ایک زبردست مہم کا حال بیان کیا گیا ہے جو سنہ ۱۹۳۴ء میں ولی مرکل کی سرداری میں گئی تھی۔ اس پارٹی کے سب ممبر جرمنی تھے۔ جن کا مقصد صرف اونچائی پر چڑھنا ہی نہ تھا بلکہ سائنٹفک بھی تھا تاکہ بلند مقامات پر پہنچکر وہاں کے موسمی حالات اور اُن کے اثرات کا اندازہ کرسکیں۔ چنانچہ اپنے ساتھ ان لوگوں نے چند سائنسداں بھی لئے تھے اور ایک بہترین فوٹوگرافر بھی ساتھ تھا جس کے تیار کئے ہوئے فوٹوؤں کو دیکھ کر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ گویا خود ہم اس پہاڑ پر موجود ہیں۔ قُلی بھی ان لوگوں کو بہت اچھے اور تجربہ کار مل گئے تھے دارجیلنگ سے قلیوں کی ایک بڑی تعداد صرف اسی مقصد کے لئے بلوائی گئی تھی۔

مگر انسان سوچتا ہے کچھ، ہوتا ہے کچھ۔ یہ زبردست پارٹی جس کو جرمنی حکومت کی پوری پوری مدد ملی تھی جس کے ساتھ نہ صرف ریلوے نے ہمدردی کی تھی، بلکہ جہازوں کی کمپنی اور ہندوستانی حکومت نے ہر ممکن آسانی مہیا کی۔ اپنی منزل کے سامنے سے صرف موسمی خرابی کی وجہ سے واپس ہوئی۔ اب ان کی کہانی خود ان کے ایک ساتھی (وِٹنز لبشٹولڈ) کی زبانی سُنئے۔

روانگی کی تیاری

ہمارے لیڈر مسٹر ولی مرکل نے اپنے پچھلے (سنہ ۱۹۳۲ء کے) تجربے کی بنا پر اس مرتبہ ایسے لوگوں کو اپنی پارٹی میں شامل کیا جن کو اونچے پہاڑوں پر چڑھنے کا کافی تجربہ تھا۔ ان لوگوں کے نام یہ تھے:

(۱) پیٹر اشنبرینز (۲) فرٹز لبشٹولڈ (مصنف مضمون ہذا) (۳) ولی برنارڈ (ڈاکٹر) (۴) الفریڈ ڈرکسل۔ (۵) ہنس ہیرونمن (کیمپ کمانڈر) (۶) ولی مرکل (لیڈر)

[1] وہ جگہ جہاں جانے کا ارادہ کیا گیا ہو یا جہاں جانا مقصود ہو۔

(۷) پیٹر مولر جیٹر (۸) اروِن شنیدر (۹) ولی ولزنباخ (۱۰) الی وائلینڈ ۔

علاوہ اِن کے یہ تین آدمی سائنٹفک مقاصد کے لئے ساتھ تھے

(۱) رچرڈ فنسٹر والڈر (۲) والٹر رائکل : ماہر جغرافیہ اور (۳) پیٹر مسیچ ۔

اس عظیم الشان مہم کے لئے بے انتہا تیاریوں کی ضرورت پیش آئی ۔ جرمنی سے روانگی ، ہندوستان کا سفر اور اس کے بعد ان مقامات پر جانا جہاں پہلے انسان کا گذر نہ ہوا ہو ۔ برلن سے انگلستان اور ہندوستان تک خطوں کا ایک تانتا لگا ہوا تھا ۔

مسٹر مرکل (لیڈر) کے کمرے میں ایک طرف ٹائپ رائٹر کی کھٹا کھٹ ہو رہی تھی اور دوسری طرف ٹیلیفون کی گھنٹی تھی کہ ہر سیکنڈ پر پیغامات سُنا رہی تھی ۔ مسٹر مرکل ایک زبردست طاقت اور منتظم طبیعت کے انسان تھے ۔ صرف اس مقصد کے لئے انھوں نے دو سفر انگلستان کے بھی کئے تھے ۔ یہاں انھوں نے ایورسٹ پر چڑھائی کرنے والوں سے مشورہ لیا ۔ جس مقام پر وہ اپنے سفر کا ذکر کرتے ہر شخص اُن کو ہاتھوں ہاتھ لیتا اور ان کی کامیابی کی دل سے دعا کرتا ۔ خدا خدا کر کے انتظامات مکمل ہوئے ۔ مسٹر ڈرکسل کے ذمّے سامان کی دیکھ بھال اور قلیوں کا انتظام ہوا ۔ مسٹر ولزنباخ کے سپرد باورچی خانہ ہوا ولزنباخ کی والدہ نے روانگی کے وقت تک اپنے بیٹے کے کام میں بہت مدد دی ۔

ہمارے ایک ساتھی کو یونیورسٹی کا امتحان بھی دینا تھا چنانچہ یہ زمانہ ان کے لئے بہت کٹھن تھا ۔ اپنے راستے کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے ہم لوگوں نے بے شمار تصویریں جمع کر رکھی تھیں ۔ اور واپسی پر دوسروں کے سامنے اپنی کارگزاری کا ثبوت پیش کرنے کے لئے بہترین کیمرے کا بھی انتظام کیا گیا تھا اور اس مقصد کے لئے تصویر چھاپنے کے جدید ترین طریقوں کا استعمال بھی سیکھا تھا ۔ ایک خیمہ اندھے کمرے کا کام دینے کے لئے خاص طور پر بنوایا تھا ۔ سنہ ۱۹۳۲ء والی مہم کی ناکامی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کافی بلندی پر ہم لوگ آگ نہ جلا سکتے تھے ۔ چنانچہ اس مرتبہ جرمن یونیورسٹیوں کے بہترین سائنسدانوں سے بھی اس معاملہ میں مشورہ لیا تھا ۔

سری نگر تک

سامان کی تیاری شروع ہونے کے وقت سے روانگی کے وقت تک الوداعی پارٹیوں اور دعوتوں کا ایک سلسلہ تھا کہ ختم ہی نہ ہوتا تھا ۔ ہمارے لیڈر مسٹر مرکل اور ساتھی مسٹر ڈرکسل ریلوے میں ملازم تھے ۔ ایک دعوت ان کے دوستوں نے بھی روانگی کے وقت دی ۔ ۲۵ ۔ مارچ کو اتوار کے دن چار آدمیوں کی پارٹی بطور پیشبندی روانہ ہوئی تاکہ ہندوستان پہنچکر یہ لوگ شروع کے انتظامات مکمل کریں ۔ اس پارٹی میں علاوہ مسٹر مرکل (لیڈر) کے اشنبرنر ۔ شنیدر اور وائلینڈ تھے ۔ اصل پارٹی کی



ننگا پربت کی مہم میں شریک ہونے والے جرمن
ان آزاد لوگوں کی الگ ہم غلاموں کے بچوں میں بھی سبق ہیں
دائیں سے بائیں تک (اگلی صف) شنیڈر، مارٹنچ، اشیرنگر، مرکل (لیڈر)، بیچ-
مولر اور دولی-
(پچھلی صف) بیرنس، ویلینڈ، سیفاسر، مہم میں شامل-



ننگا پربت کی مہم کے وقت (اس دن کا انتظار ہے کہ ہندوستانیوں میں سے کوئی ایسی مہم سر کرے اور نیچے کی جگہ دیں ان ہندوستانی سورماؤں کی تصویریں چھپ سکیں)-

جرمن آزاد منچلوں کے ہندوستانی غلام مددگار



نانگا پربت کی چٹانیں



[illegible] اور ... دوسرے
کیمپ پر چڑھ رہے ہیں۔

یہ تصویریں مشہور جرمن [illegible] نوجوان کی دیا سے لی گئیں۔

روانگی سولہ دن کے بعد ہوئی۔ وہ لوگ ۲۷ مارچ کو وکٹوریہ جہاز پر سوار ہوئے ہندوستان پہنچ کر ان چاروں کو ہر طبقہ سے کافی مدد ملی۔ مسٹر مرکل اور واٹلینڈ بمبئی سے نئی دہلی آئے۔ اس کے بعد کلکتہ جاکر جرمنی قونصل جنرل سے معاملات طے کئے۔ اور روپے کی ضرورت کے وقت فراہمی کے انتظامات مکمل کئے۔ اس کے علاوہ ان لوگوں نے اپنے راستوں کے نقشے مطالعہ کئے۔ دو ایک جگہ اپنا مقصد سفر بیان کرنے کے لئے لکچر بھی دیے۔

مسٹر شنیدر اور اشنبریز راولپنڈی سے سری نگر تک سامان لے جانے میں مصروف تھے۔ ان لوگوں نے سامان لانے لے جانے کے لئے ایک کمپنی سے گفتگو کی۔ بعد میں مسٹر مرکل نے سری نگر پہنچکر وہاں کے ریزیڈنٹ سے مل کر قلیوں اور ٹچروں کا بندوبست کیا۔ مسٹر واٹلینڈ اس عرصے میں دارجیلنگ چلے گئے۔ جہاں انہوں نے ہمالیہ کلب کی مدد سے پہاڑ پر سامان لے کر چڑھنے والے قلیوں کا انتظام کیا۔ دارجیلنگ میں اس قسم کے لوگ آسانی سے مل جاتے ہیں۔ بلکہ گزشتہ چند سالوں میں متعدد پہاڑی پارٹیوں کے روانہ ہونے سے وہاں پر ایسے قلیوں اور باربرداروں کی اچھی خاصی آبادی ہوگئی ہے۔ جن میں چند قلی ایسے ہیں جن کو تقریباً ہر پارٹی کے ساتھ پہاڑوں پر چڑھائی کا موقع ملا ہے۔ اپنے تجربے کی وجہ سے وہ لوگ پہاڑی راستوں اور مشکلات سے بخوبی واقف ہوگئے ہیں۔

۱۹۳۲ء کی پارٹی کی ناکامیابی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ قلی وقت کے وقت ساتھ نہ دے سکے تھے۔ چنانچہ اس مرتبہ اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا تھا کہ ایسے لوگ بھرتی کئے جائیں جو مشکل سے مشکل وقت میں بھی دھوکہ نہ دیں۔ اس مسئلہ کی طرف شروع ہی سے خاص توجہ کی گئی تھی۔ دارجیلنگ کے محکمۂ جنگلات کے افسروں کی مدد سے ان قلیوں کی مزدوری اور دوسری شرطیں آسانی سے طے ہوگئی تھیں۔ مسٹر رٹلیج (لیڈر ایورسٹ پارٹی) کی ۱۹۳۳ء کی مہم کے تجربے سے ان لوگوں کی غذا کا بھی ویسا ہی بندوبست کیا گیا تھا۔ بالآخر قلیوں کی ایک پلٹن معائنہ کے لئے ایک قطار میں کھڑی ہوئی اور ۳۰ قلیوں کا انتخاب ہوا۔ منتخب قلیوں میں ایک ایسا تھا جو نو مرتبہ ہمالیہ کی بلند چوٹیوں کی سیر کر آیا تھا۔ تین چار قلی ایسے تھے جن کو تین چار مرتبہ چڑھائی کا موقع ملا تھا۔ یہ سب بڑے فخر سے اپنے گزشتہ کارناموں کے سرٹیفکٹ دکھاتے تھے۔

دارجیلنگ سے روانگی کے قبل ان سب کا ڈاکٹری معائنہ ہوا اور سب کے سب بڑی خوشی کے ساتھ اپنی مہم پر روانہ ہوئے۔ بڑے صاحب (مسٹر مرکل) کو دیکھنے کا سب کو بیحد اشتیاق تھا۔

برلن سے اصل پارٹی پروگرام کے مطابق سولہ دن بعد روانہ ہوئی۔ چلتے وقت ایک بدشگونی یہ ہوئی کہ ہمارے کیمپ کمانڈنٹ مسٹر بومیسٹر عین روانگی کے

دن بیمار پڑ گئے۔ بدرجۂ مجبوری اُن کو چھوڑنا پڑا اور ۱۳ ر اپریل کو ہم لوگ کونٹے وردی (Conteverde) جہاز سے روانہ ہوئے۔ اور راستے کے پُرلطف مناظر سے محظوظ ہوتے ہوئے بمبئی پہنچے۔ ہم کو وینس سے بمبئی تک پہنچنے میں گیارہ دن لگے۔ اور تقریباً پانچ ہزار میل کا راستہ طے کیا۔ جہاز کی رفتار اس عرصے میں اوسطاً بیس میل فی گھنٹہ تھی۔ ہمارے جہاز میں ایک دوسری پارٹی بھی تھی وہ لوگ کوہ قراقرم پر چڑھائی کرنے جا رہے تھے۔ اِن سے گفتگو میں بہت لطف آتا تھا افسوس کہ اِس وقت ہمارے ساتھ کوئی اخباری نمائندہ نہ تھا جو ہم لوگوں کی اس پُرلطف 'رقابت' کا ذکر اخباروں میں کرتا۔

۲۵ ر اپریل کو ہم لوگ بمبئی پہنچے۔ یہاں ہم کو مسٹر مرکل کا تار سری نگر سے ملا کہ "فوراً چلے آؤ"۔ چنانچہ شام تک سب سامان مکمل کر کے ہم لوگ سری نگر کے لئے روانہ ہو گئے۔ راولپنڈی کے اسٹیشن پر ۲۷ ر اپریل کو مسٹر واٹلینڈ اور شنیڈر نے ہمارا استقبال کیا۔ اور ہمیں بتایا کہ صرف ہم لوگوں کا انتظار تھا ورنہ روانگی کا تمام سامان تیار تھا۔

دوسرے دن صبح کو روانگی مقرر ہوئی تھی۔

راولپنڈی سے ۹ گھنٹے سفر کرنے کے بعد ہم لوگ وادیٔ کشمیر میں داخل ہوئے جہاں کے پُرفضا مناظر اور سبزہ زاروں نے ساری تھکن دور کر دی۔ اتنے دلوں تک چلنے کے بعد درحقیقت ہم لوگ جنت میں پہنچ گئے تھے۔ کشمیر میں ہماری ملاقات مسٹر مرکل اور اشنبرینز سے ہوئی اور سب کی یکجائی نے لطف دوبالا کر دیا۔ اِن لوگوں نے یہاں پہلے سے پہنچکر تمام انتظامات مکمل کر لئے تھے اور سنہ ۱۹۳۲ء میں جن مشکلات سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ اِس مرتبہ وہ سب آسان تھیں۔ دارجیلنگ سے آئے ہوئے ۳۷ آدمیوں میں سے ہر شخص نے ایک ایک اردلی اپنے لئے منتخب کر لیا۔ اردلی بھی اپنے آقا کی خدمت میں آکر بہت خوش تھے۔ ہمارے سامان کے کل ۷۰ عدد تھے جو کشتیوں کے ذریعے باندی پور تک پہنچائے گئے اگرچہ اِن دنوں بارش ہونے لگی تھی اور اخبار والوں نے بھی اس بارش کا ذکر کافی اہمیت کے ساتھ کیا تھا۔ مگر ہم لوگ کمر بستہ ہو کر دوسرے دن روانہ ہو گئے۔ کیونکہ 'ہمالیہ' ہمارا منتظر تھا۔

ہمالیہ پر

سری نگر سے روانہ ہونے کے بعد ہم لوگ وولر جھیل سے گذرے اور جھیل کو پار کرنے پر ہمارا خیر مقدم چھ سو قلیوں نے کیا جن کو ہمارے سامان کے لیجانے کے لئے پہلے سے وہاں کے ایک افسر نے تیار کر رکھا تھا۔ سامان کو دیکھتے ہی قلی اس پر ٹوٹ پڑے اس وقت لیوا نے (جو ہمارے دارجیلنگ کے

قلیوں کا سردار تھا) اس ہنگامے کے رفع کرنے میں بہت مدد دی اور اسی کے انتظام سے ان قلیوں کو سامان تقسیم کیا گیا۔ ہم میں سے چار آدمی یہاں رک گئے باقی مسٹر مرکل کی سرکردگی میں روانہ ہو گئے۔ دو سال قبل والا راستہ پھر ہمارے قدموں کے نیچے تھا اور کشمیر کی سرسبز وادیوں کو تین ماہ کے لئے خیرباد کہہ کر ہم پھر چھوٹی زمین پر روانہ ہو گئے۔ شام کے وقت ہم لوگ ترگبال کے پڑاؤ پر پہنچے۔ اور رات کو وہیں ٹھہر گئے ترگبال تقریباً بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔

علی الصباح ہمارے لیڈر نے سب کو اٹھایا اور جو اٹھنے میں ذرا بھی کسمائے اُن کے کمبل شل ان اسکول کے بچوں کے کھینچے جا رہے تھے جن کی ماں اُن کے سرہانے کھڑی ہوئی اٹھا رہی ہو اور وہ مچل مچل کر کروٹ بدل رہے ہوں۔

'لیوا' بھی اپنے فرائضِ منصبی انجام دے رہا تھا۔ اگر ہمارا لیڈر ہم لوگوں کو اٹھا رہا تھا تو قلیوں کا جمعدار بھی تمام باربرداروں کو خبردار کر رہا تھا۔ جلدی جلدی سب لوگ اُٹھ بیٹھے۔ ہمارے سامنے نیچے کشمیر کی سرسبز وادی تھی۔ اور اوپر برف ہی برف جس کی چمک سے آنکھوں میں چکاچوند ہو رہی تھی۔ کافی عینکیں نہ ہونے کے باعث نگاہ نہ ٹھہرتی تھی اس لئے ڈاکٹر برنارڈ کھڑے ہوئے سب کی آنکھوں میں دوا ڈال رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد روانہ ہو کر ہم لوگ کورگبال پہنچے۔ لیکن اِس چڑھائی میں ہمارے سب کپڑے نم ہو گئے تھے۔ قلی بھی آہستہ آہستہ پہنچ رہے تھے اور شام کے وقت جب سب جمع ہو گئے تو اس راستہ کو آسانی سے طے کرنے پر ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہا تھا۔

دو تین روز اسی طرح چڑھائی کرتے ہوئے ہم لوگ وادیِ سندھ میں داخل ہو گئے۔ اِس عرصے میں کئی تجربے ہوئے۔ برف راستے میں گرتی ہوئی کئی جگہ ملی اور بعض اوقات آنکھوں میں گھسی جاتی تھی جس سے اکثر قلیوں کو بہت تکلیف ہوتی تھی۔ ڈاکٹر برنارڈ کی ہمت افزائی اور مدد سے یہ منزل آسانی سے طے ہو گئی۔ اس دوران میں ہم نے ۶۰ قلیوں میں سے آدھے قلیوں کو رخصت کر دیا۔ کیونکہ قواعد کے بموجب دوسرے خطے کے قلی یہاں سامان نہیں لے جا سکتے تھے۔

وادیِ سندھ

اس میدان میں پہلی رات ہم کو آسمان کے نیچے گزارنی پڑی اور خانہ بدوشی کا پورا پورا لطف آیا۔ دوسرے دن صبح کو دو گھنٹے کی مسافت کے بعد ہم لوگ خیموں میں داخل ہوئے۔ یہاں ہماری چیزیں سلیقے اور قرینے سے لگی ہوئی تھیں۔ ہر ایک اردلی اپنے آقا کی چیزوں کی حفاظت اپنی جان کی طرح کر رہا تھا۔ چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی ان کی نگاہوں میں رہتی۔ ایک مرتبہ

میں نے اپنے اردلی پاسنگ سے اپنی ایک نوٹ بک کے متعلق دریافت کیا الفاظ میرے منہ سے نکلے ہی تھے کہ کتاب میرے ہاتھ میں تھی۔ ایک صابن کی ٹکیا پر دو قلی آپس میں تکرار کر رہے تھے اور ہر ایک کا یہ دعویٰ تھا کہ صابن اس کے آقا کی ملکیت تھا۔ وہ دونوں اپنی اپنی جگہ بالکل سچے تھے کیونکہ بعد میں پتہ چلا کہ ابن ان دونوں کے آقاؤں کے مشترکہ استعمال میں رہا کرتا تھا مشکل سے مشکل وقت میں بھی ان پہاڑیوں کے چہروں پر مسکراہٹ اور خندہ پیشانی کے آثار نمایاں رہتے تھے۔

باوجود زبان کی ناواقفیت کے ہم لوگ اکثر اوقات ان کی باتوں سے دل بہلایا کرتے انہوں نے اپنے آقاؤں کی پہچان کے انوکھے طریقے ایجاد کر رکھے تھے مثلاً مسٹر مرکل کو بڑا صاحب کہتے تھے مسٹر مولیٹر کا نام کھانے والا صاحب تھا مسٹر بیچے چھوٹے صاحب تھے



وادیٔ سندھ کو پار کرنے میں بھی تین چار دن لگ گئے۔ یہاں پر ہم لوگوں کو اپنے ریڈیو سٹ کے تجربے کا موقع ملا۔ ایک موقعہ پر ہم لوگوں کا ہنسی کے مارے برا حال تھا جب کہ پہاڑی قلیوں نے ریڈیو پر گفتگو شروع کی۔ میرا نوکر پاسنگ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوگیا جب وہ ریڈیو کے سامنے بیٹھا ہوا اپنے دوست پالٹن کی گفتگو سن رہا تھا۔ ان لوگوں کو ریڈیو سے ہٹانا بہت ہی مشکل تھا۔

میں نے بھی اس جگہ کے چند لاجواب فلم تیار کئے تھے۔ افسوس کہ بارش کے سبب وہ سب بہہ گئے۔ اس وادی میں ہم کو اپنا ۱۹۳۲ء والا راستہ چھوڑ دینا پڑا کیونکہ اس مرتبہ میدان کا راستہ ہم کو صاف مل گیا تھا اور ہم



۷

یہ امدادی دستہ لیڈی کو بچانے جا رہا ہے



۷

پسلنگ کے جلے ہوئے ہاتھ

یہ تصویریں مشہور جرمن اخبار نوجوان کی دنیا سے لی گئیں



الفریڈ فرانس کا آخری سفر

اس بہادر جرمن نے راستے کی مشکلوں کی ذرا
پرواہ نہ کی حتیٰ کہ جان دے دی اور اپنی اس آزادی
سے بڑھ کر ایسی ہی قومیں مرنے کے بعد بھی زندہ
رہتی ہیں اور اپنی قوم کی عزت و وقار کو چار چاند
لگاتی ہیں۔ خدا کرے ہم بھی ایسے ہی ہمت اور
جرأت مند بنیں۔

یہ تصویر مشہور جرمن اخبار نوجوان کی دنیا سے لی گئی

دریائے سندھ کو پار کر کے دوسری طرف پہنچ گئے پارٹی کے کچھ لوگ موسم خراب ہو جانے کی وجہ سے دوسری طرف سے گھوم کر آئے۔ دریا کو پار کرنے کے بعد ہم نے پہلی مرتبہ ننگا پربت کو دور سے دیکھا اور اس پُرہیبت منظر نے ہمارے دلوں کو عجیب طرح کی کیفیت سے بھر دیا۔ جرمنی سے ہماری روانگی کو پورے چار ہفتے گزر چکے تھے۔ یہ زمانہ ان مشکلات کے سامنے کچھ نہ تھا جن سے ہم کو دوچار ہونا پڑا تھا۔ مسٹر مرکل کی دور اندیشی برٹش گورنمنٹ، ہندوستانی افسران کی مدد اور ریاست کشمیر کی ہمدردی نے ہم لوگوں کو ہر جگہ فائدہ پہنچایا۔ دریائے سندھ کے دامن سے ننگا پربت کی چوٹی تک تیئیس ہزار فٹ کی بلند دیوار ہے۔ یہ دنیا کی بلند ترین بلندیوں میں سے ہے۔ کاش ہم اس کو فتح کر سکتے۔

رکھیاٹ نالہ

وہم بھی بعض اوقات انسان کو طرح طرح کی مشکلوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔ شکر ہے کہ ہم لوگ اس وبا سے محفوظ رہے اگرچہ ہم لوگوں کی تعداد تیرہ تھی۔ روانگی کی تاریخ بھی تیرہ اور اس پر طرّہ یہ کہ ہمارے جہاز کے کیبن کا نمبر بھی تیرہ تھا۔ یہ دیکھ کر کہ اس نحس نمبر نے اب تک اپنا کوئی اثر ہم لوگوں پر نہیں کیا تھا کوئی وجہ آئندہ پروگرام میں خلل اندازی کی نظر نہ آئی۔

ننگا پربت کی چڑھائی شروع ہونے سے پہلے ایک بار پھر ہم لوگوں کو دریائے سندھ پار کرنا پڑا اور اس مرتبہ اس پُل کے ذریعہ ہم لوگ پار ہوئے جس کا نام "رکھیاٹ" کا پُل ہے۔ اس مقام پر ایک چشمہ ہے جہاں سے ہر وقت گرم پانی اُبلتا رہتا ہے، اور ٹھنڈا ہونے پر اس پانی سے سڑے ہوئے انڈوں کی بُو آتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ پانی صحت کے لئے بہت مفید ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم لوگوں کو تجربے کا موقع نہیں ملا۔ اسی چشمے کے کنارے ہم لوگوں کے خیمے لگائے گئے اور ہمارا جھنڈا ان خیموں پر لہرا رہا تھا۔ گویا ننگا پربت کی چوٹی کا سفید برف اس کو خوش آمدید کہہ رہا تھا۔

اس مقام سے کچھ قلیوں کو علیحدہ کر دیا گیا کیونکہ ان کی تعداد ہم لوگوں کے اخراجات کے لحاظ سے بہت زیادہ تھی۔ دوسرے دن کے پروگرام کے متعلق ہم لوگوں کو یہ احکامات دئیے گئے۔

"کل علی الصباح سب صاحب لوگ برف پر چڑھنا شروع کرینگے۔ مقامی قلیوں کو رخصت کر دیا جائے گا بنیادی کیمپ کا راستہ مل جانے پر دارجیلنگ کے قلی باری باری سامان پہنچائیں گے"۔

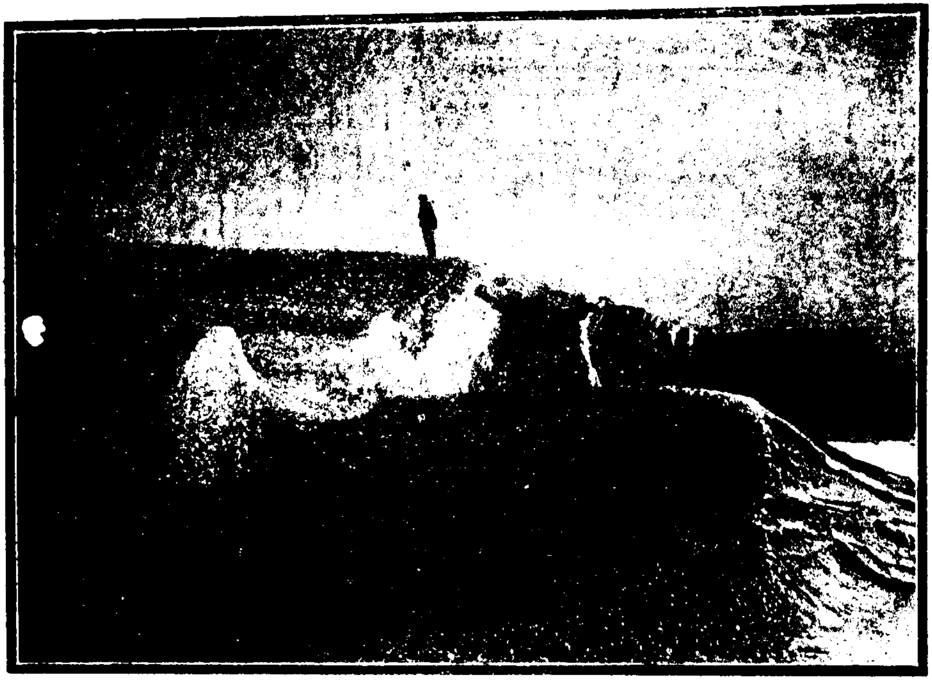
دوسرے دن صبح کو ہم لوگوں نے برف پر چڑھنا شروع کیا۔ جہاں ہمارا خیمہ آٹھ سو دس فٹ کی بلندی پر نصب کیا جانے والا تھا۔ ایورسٹ اور کنچنجنگا کے تجربہ کار قلیوں نے خیمہ نصب کرنے کے لئے مناسب جگہ کی تلاش شروع کی اور تھوڑی محنت کے

بعد دو مہینہ ان ہم لوگوں کو مل گئے۔ شام تک خیموں کا ایک چھوٹا سا شہر آباد ہوگیا تھا۔ ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر مرتب تھی۔ اپنی کامیابی کا اظہار کرنے کے لئے جھنڈا بھی لہرا رہا تھا۔ قلیوں کو ان کی اُجرت دے کر رخصت کر دیا گیا۔ ان کے چلے جانے سے ہم لوگوں کی تعداد میں کافی کمی ہوگئی اس لئے حفاظت کے لئے رات بھر خیموں کے چاروں طرف آگ جلائی گئی۔

صبح اُٹھنے کے بعد ہم نے اپنے کو چاروں طرف سے گھرا ہوا پایا۔ دارجیلنگ کے پہاڑی قلیوں نے اپنی مذہبی رسموں کے موجب بڑی بڑی چادریں بچھا کر ان پر عبادت...... شروع کی اور پہاڑوں کے دیوتا کی خدمت میں آٹے وغیرہ کی بھینٹ چڑھائی۔

۲۹ مئی کو پہلی پارٹی بنیادی خیمے کے لئے روانہ ہوئی۔ برف اس وقت تازہ گری تھی۔ جمعدار سے لے کر باورچی خانہ کے قلیوں کو اس دن باربرداری کرنا پڑ رہی تھی۔ صاحب لوگ آگے آگے راستہ بتاتے جاتے تھے اور ان کے پیچھے قلیوں کی لمبی قطار تھی۔ برفستانی پہاڑوں پر چڑھائی آسان کام نہیں ہے۔ صرف ننگا پربت فتح کرنے کا جذبہ تھا جو ہم لوگوں کی ہمت بڑھا رہا تھا۔ ورنہ بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر برف کاٹ کر راستہ بنانا بہت مشکل کام تھا۔ لیکن ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ ہم لوگوں نے کسی نہ کسی طرح راستہ بنا ہی لیا اور آخر کار پہنچتے پہنچتے اُس جگہ پر پہنچ گئے جہاں آج سے دو سال پہلے فرطِ مسرت سے بیتاب ہو کر مثل بچّوں کے ہم لوگ اِدھر اُدھر دوڑتے پھرتے تھے۔ اپنے پُرانے نشانات میں سے اُس وقت سوائے برف کے تودوں کے ہم لوگوں کو کچھ نہ ملا۔ بہت ہی دشواری کے بعد سٹر مرکل کو برف میں دبے ہوئے دو ڈنڈے ملے۔ کچھ کُھدائی کرنے پر پتہ چلا کہ یہ ہمارے باورچی خانے کے خیمے کے بانس تھے۔

یہاں پہنچکر ہمارے ایک ساتھی نے ایک بھیڑیے کا شکار کیا۔ شام کو جب ہم لوگ راستہ تلاش کر کے واپس ہوئے تو انہوں نے ہم کو دو چھوٹے بچے بھیڑیے دکھائے۔ ایک کا نام ہم نے ننگا رکھا اور دوسرے کا پربت۔ بہت ہی جلد وہ بچے ہم سے مانوس ہو گئے۔ ابتدا میں انہوں نے اپنی وحشیانہ عادات کا اظہار کیا۔ لیکن انسانوں میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد وہ اپنی وحشت کو بھول گئے۔ ہم لوگوں کو بھی ان سے کافی دلچسپی ہوگئی۔ اور جب ننگا پربت کی چڑھائی کا ذکر کر کے ہم لوگ تھک کر لیٹتے تو ہماری گفتگو کا موضوع ننگا اور پربت کی تربیت ہوتا۔ (باقی آئندہ)



قطب شمالی کے برفستان میں زندگی کا یہ منظر اس کا ادعان صرف ایک محقق کی طرح
ایسے دیکھ رہی ہے۔ مگر قدرت موت میں زندگی کا ثبوت دکھاتی ہے۔ گلہریوں کے سینوں
میں آزادی کا ولولہ پیدا کرتی ہے۔ تازگی اور روانی بھرتی ہے۔ وہاں مردہ سردی
میں زندگی کا یہ منظر بھی دکھاتی ہے۔



اسی قطب شمالی میں
ایک منظر



[illegible]



[illegible]

جی حلالی سختیین درنده بندپائی

برفستانی رتیجهد ... چه

کیڑے جمع کرنا



از محمد طیب صاحب بی اے جامعہ

چیزیں جمع کرنے کے سلسلے میں کیڑے مکوڑے اور عجیب و غریب جانور جمع کرنے کا شوق بھی بہت اہم اور دلچسپ مشغلہ ہے۔ عجائب خانوں میں تم نے بے شمار عجیب و غریب جانور دیکھے ہوں گے بہت سے ننھے ننھے سانپ اور کیڑے مکوڑے بھی شیشوں میں بند! یہ سب چیزیں ایسے ہی شوقین لوگوں نے جمع کی ہیں۔ نیچے ہم ایک ایسے شخص کے واقعات خود اس کی زبانی لکھ رہے ہیں جس نے دُور دُور ملکوں کا سفر کر کے بہت سی عجیب و غریب چیزیں جمع کیں۔ امید ہے کہ اس مضمون کو تم بہت توجہ اور دلچسپی سے پڑھو گے　　(ایڈیٹر)

دنیا میں طرح طرح کے شوق ہیں، اچھے بھی بُرے بھی بُرے شوقوں سے تو خدا ہمیں تمھیں سب کو بچائے رکھے اچھے شوق بھی کچھ تو ایسے ہیں جن میں بس دلچسپی ہی دلچسپی ہے اور فرصت کا وقت اچھی طرح کٹ جاتا ہے۔ مگر بعض ایسے بھی ہیں جن میں دلچسپی کے ساتھ اپنا اور دوسروں کا فائدہ بھی ہوتا ہے۔ ایسے شوق بہت سے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ جنگلوں ساحلوں اور میدانوں سے اپنے عجائب خانے کے لئے تتلیاں، چڑیوں کے انڈے کیڑے مکوڑے اور چھوٹے چھوٹے سمور دار جانور (گلہری وغیرہ) جمع کرو یہ شوق بڑھ گیا تو کیا عجب جو تم اس قسم کی عجیب و غریب چیزیں جمع کرنے کی خاطر گھر سے بہت دور نکل جاؤ اپنے ملک کے باہر! اور ہر طرح کی نئی نئی معلومات حاصل کرو۔

کھیتوں اور باغوں کے جانور تو ہم رات دن دیکھتے ہی ہیں ان کے بارے میں ہم سے پہلے لوگوں نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں اور جگہ جگہ ان کا ذکر کیا ہے۔ جی تو یہ چاہتا ہے کہ کہیں باہر کا سفر کریں بڑے بڑے ہیبت ناک جانوروں سے مقابلہ ہو۔ پہاڑی ریچھ ملیں اور تیس تیس فٹ لمبے اژدھے ایسے ایسے جنگلوں سے گذریں جہاں ہم سے پہلے کسی کے

قدم نہ گئے ہوں۔

چھٹی کے دن شکار کے شوقین لڑکے بندوق لے کر نکل جاتے ہیں اور بے تحاشا جانوروں کو گولی کا نشانہ بناتے ہیں انھیں یہ خیال نہیں آتا کہ ان میں کوئی خاص اور دلچسپی کی بات تو نہیں۔ مگر جنھیں اچھے اچھے اور نئی نئی قسم کے جانور جمع کرنے کا شوق ہے۔ وہ چھریاں، چمٹے، اور بندوقیں لیکر گھنے جنگلوں اور باغوں میں نکل جاتے ہیں۔ اور اب تو بندوق وغیرہ بھی بہت کم موقعوں پر استعمال کی جاتی ہے اس لئے کہ اس سے چھوٹے جانور تو بالکل ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ امریکہ اور یورپ کے عجائب خانوں میں زیادہ تر چیزیں ایسی ہیں جو جالیوں اور چند شیشے کی نلکیوں سے پکڑی گئی ہیں۔ بندوق تو بڑے جانوروں کے شکار کے لئے مناسب ہے۔ چھوٹی چیزوں کے لئے جالی اور نلکیوں سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ آج کل ان کا رواج روز بروز بڑھ رہا ہے اور ننھے منھے نئے نئے جانور برابر پکڑے جا رہے ہیں۔

ایشیا کے بعض شمالی جنگلوں، جنوبی امریکہ، افریقہ اور شمالی مغربی آسٹریلیا کے بڑے بڑے سانپ تو مشہور ہی ہیں لیکن چھوٹی قسم کے سانپ بھی ملتے جا رہے ہیں۔ ان چھوٹے سانپوں اور چھپکلیوں کے لئے بندوق کی ضرورت نہیں۔ اگر تمہارے پاس ایک لمبی چھڑ ہو جس کے سرے پر جالی لٹکی رہتی ہے تو اس سے چھوٹی مچھلیاں اور کیڑے مکوڑے سب کچھ پکڑ سکتے ہو۔

جنگل اور باغوں میں پروانوں اور پتنگوں کے ساتھ ساتھ مکھیاں۔ شہد کی مکھیاں۔ بھڑیں، تتیئے، مچھر (یہ بہت ضروری ہیں) ڈنک والی مکھیاں۔ کھٹمل اور مکڑیاں اور اسی قسم کے چھوٹے چھوٹے جانور پکڑو کسی پھول والی جھاڑی میں اسی قسم کے چھوٹے چھوٹے چھوٹے جانوروں کا جھنڈ کا جھنڈ ملے گا۔ ایسی جگہوں پر تھوڑی دیر میں تمہیں اتنے جانور مل جائیں گے کہ اور کہیں شاید صبح سے شام تک نہ مل سکیں۔

ایک دیوار، ٹیلے یا درخت کا تنہ جس پہ ہلکی ہلکی دھوپ بھی آتی ہو۔ اور پاس ہی کوئی نالہ، جنگل یا پہاڑ کا کنارہ ہو تو پھر وہاں کیڑے مکوڑوں کی افراط ہوگی۔ بس دھوپ کی طرح پھیلے پڑے ہونگے۔ ایسی جگہوں پر اس کا خیال رکھنا کہ تمہارا سایہ تم سے پہلے ان پر نہ جا پہنچے ورنہ یہ ننھے ننھے جانور اس طرح اُڑ جائیں گے کہ تمہیں پتہ بھی نہ چلیگا۔

کبھی کبھی ایسی ایسی جگہ جانور مل جاتے ہیں جہاں اُن کے وجود کا وہم وگمان بھی نہیں ہوتا۔ گھنے جنگلوں میں جہاں دھوپ کا گذر نہیں، بے شمار جانور کسی ایسے درخت پر جمع ہو جاتے ہیں جس پر ذرا ذرا سی دھوپ آتی ہو۔ جن پہاڑیوں پر دھوپ پھیلی ہو۔ وہاں تمہارے لئے شکار کی بہتات ہوگی۔ ایسی جگہوں پر یہ بھی ضروری نہیں کہ تم جالی کے شکار میں مہارت رکھتے ہو۔ بس ذرا پھرتی کی ضرورت ہے۔ ہاتھ سے بھی بیسیوں پکڑ سکتے ہو۔ کبھی کبھی ایک سادہ شیشے کی نلکی جس پر ڈاٹ لگی ہو جالی سے بھی زیادہ کارآمد ثابت ہوتی ہے۔

بعض لوگ کائی اور درخت کی چھال میں کیڑے تلاش کرتے ہیں، مگر اس کا دارمدار زیادہ تر وہاں کی خشکی پر ہے اس کے بھی کہ کن کیڑوں کی تلاش ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایسی جگہوں پر زیادہ کامیابی نہیں ہوتی البتہ کسی شہتیر یا درخت کے تنے کے نیچے جو زمین پر پڑا ہو۔ کیڑوں کے شہر کے شہر آباد ملیں گے خشک موسم میں پتھروں کے نیچے بہت سے کیڑے مل سکتے ہیں



چینی تعجب سے دیکھ رہے ہیں اور مذاق اڑا رہے ہیں

چند سال ہوئے جاڑوں کے موسم میں میں چین میں کچھ جانور جمع کرنے گیا تھا وہاں کی زمین بالکل خشک تھی اس لئے زیادہ کامیابی نہیں ہوئی لیکن پہاڑوں کے دامن میں پتھروں کے نیچے اور ان نالوں کے پاس جو اب خشک ہو گئے تھے، زمین میں کافی تری تھی اور مجھے طرح طرح کے کیڑے ملے۔ ایسے موقع پر دیہاتی بلکہ شہری بھی تمہیں تعجب کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ تمہارے پاس بندوق ہو تب تو خیر سمجھیں گے کہ شکار کو جا رہے ہو۔ لیکن اگر تم قدم قدم پر جھک رہے ہو۔ لکڑی سے زمین کرید رہے ہو۔ یا پتھر کے نیچے سے کیڑے نکال کر شیشی میں بند کر رہے ہو تو کوئی عجب نہیں کہ وہ تمہیں خبطی اور پاگل سمجھیں۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ انہیں بڑی جستجو ہو جائے گی کہ آخر یہ بات کیا ہے۔ حقیقت معلوم کرنے کو تمہارے پیچھے لگ جائیں گے۔ یہ بات تو ان کی سمجھ میں کیا خاک آئے گی کہ تم یہ چیزیں عجائب خانے کے لئے جمع کر رہے ہو یا اپنی دلچسپی اور شوق کے لئے۔ وہ تمہیں ڈاکٹر سمجھیں گے اور یہ خیال کرینگے کہ یہ سانپ بچھو، کیڑے مکوڑے تم دواؤں کے لئے جمع کر رہے ہو۔ تم انہیں سمجھانا بھی چاہو تو انہیں یقین نہیں آئیگا۔ اور سمجھیں گے کہ تم ان کے ساتھ مذاق کر رہے ہو۔ اور ٹالنا چاہتے ہو کہ کہیں دواؤں کی ترکیبوں سے واقف نہ ہو جائیں۔ کبھی کبھی کوئی چینی زمین سے کیڑا اٹھا کر کترنے بھی لگے گا۔ اور تم ہائیں ہائیں کرتے رہ جاؤ گے۔

اگر کہیں کئی ایک چینی مل جاتے تو خوب مذاق اڑاتے اور اپنی زبان میں مجھ پر فقرے کستے۔ لیکن اکیلے دکیلے چینی سے مجھے بڑی مدد ملتی۔ چینی بچے بھی ہر موقع پر کام آتے تھے۔

بڑی مکڑی جس کا جسم مونگ پھلی یا گولف کی چھوٹی سی گیند کی برابر ہو۔ کچھ عجیب ڈراونی سی ہوتی ہے۔ مجھے اس سے بہت ڈر لگتا ہے۔ بھاگتی بھی بہت تیز ہے۔ سب سے بڑی



مکڑی میں نے جزائر فلپائن کے ایک ہوٹل میں دیوار پر سے پکڑی۔ میں نے پانی پینے کا گلاس چپکے سے اُس پر رکھ دیا۔ پھر ایک کاغذ گلاس پر ڈھانک کر اُسے دیوار سے الگ کیا اور اُسے کلوروفارم سنگھا کر بے ہوش کر دیا۔

ایک روز بعد شام کے وقت فلپائن کے جنگل میں کیڑے جمع کر رہا تھا جگہ بڑی بھیانک تھی۔ ہوا نام کو نہ تھی۔ بہت گرمی تھی اور سناٹا! آسمان پر اندھیرا چھا رہا تھا۔ یکایک میری نظر سامنے کی جھاڑیوں پر پڑی کئی ایک کے درمیان بہت بڑا جالا سا تنا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس پر زرد رنگ کا سفوف کسی نے چھڑک دیا ہو۔ اس جالے میں چھوٹی بڑی ہزاروں مکڑیاں تھیں اور مجھ سے صرف دو گز کے فاصلے پر! اس روز واقعی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ چند قدم آگے چل کر مجھے اس طرح کے بہت سے جالے ملے۔ دوسرے روز دن کے وقت میں اسی جگہ پھر آیا ان کا پکڑنا بھی آسان نہ تھا ان کے قریب جاؤ تو یہ جالے سے گھاس میں بڑی تیزی سے کود کر چاروں طرف جمع ہو جاتی تھیں اور اس سے بہت ڈر معلوم ہوتا تھا۔ میں نے انہیں ایسے پکڑا کہ جہاں دو چار بیٹھی ہوئی ملیں۔ میں نے جھپاکے سے ہاتھ گھما کر اُسی بھڑ والے جال میں لے لیا اور دس بارہ گز پیچھے بھاگا۔ جلدی سے انہیں ٹین کے بکس میں بند کر کلوروفارم سنگھا دیا کلوروفارم سنگھانا بھی ایک مصیبت کا کام تھا۔

بھڑوں کا پکڑنا بھی بہت مشکل ہے۔ یہ اکثر تتلیوں کے ساتھ کسی پھول کے پودے کے پاس ملتی ہیں۔ شہد کی خاطر نہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے کیڑے پکڑنے کے لئے بھڑیں غصے کی حالت میں بہت خطرناک ہوتی ہیں یشنسوان (چین) میں تین چینیوں پر بڑی بپتا پڑی۔ میں کچھ بھڑیں پکڑ چکا تھا۔ پاس ہی ایک درخت پر سفید سی کوئی چیز لٹک رہی تھی۔ میں یوں ہی تفریحاً اُس پر ڈھیلے پھینکنے لگا۔ وہ بھڑوں کا چھتہ تھا۔ اچانک اُس میں سے بھڑوں کی فوج نکل پڑی۔ ایک سیکنڈ تک تو وہ وہیں چھتے کے چاروں طرف گھومتی رہی۔ مگر جونہی ہمیں دیکھا بڑی تیزی سے ہماری طرف آئی ۔ہم لوگ اپنی جان لے کر بُری طرح بھاگے اور ڈھلان پر بڑی تیزی سے بھاگے ہوئے چلے گئے۔ ایک موڑ پر ہم چینی قلیوں سے ٹکرا گئے۔ یہ قلی دھیرے دھیرے اُسی طرف جا رہے تھے ہم تو رُکے نہیں اور نہ بدحواسی میں انہیں منع کر سکے یہ تینوں اُسی طرف چلتے ہی رہے نہ معلوم بیچاروں پر کیا



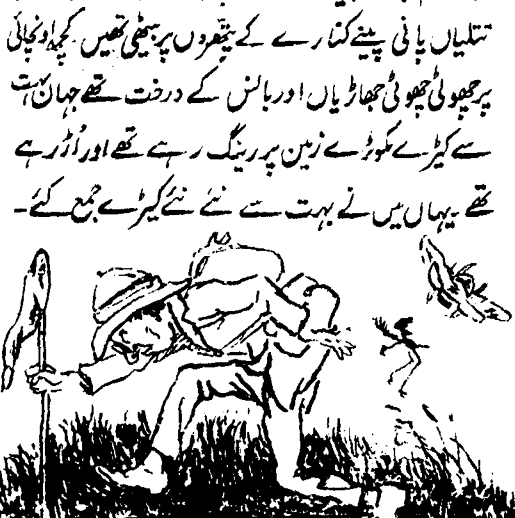
مکڑی چوہے کے پیچھے

آفت آئی ہوگی۔

گرم ملکوں کی تتلیاں غالباً بہت پیاسی رہتی ہیں یہ جنگلوں میں اکثر چشموں اور دریاؤں کے قریب کثرت سے ملتی ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ آہستہ سے وہ کسی پانی کے پودے کے قریب پانی پینے اُتر آتی ہیں۔ اُن پہاڑیوں پر جہاں دھوپ تیز ہوتی ہے اگر کوئی چشمہ آبشار کی طرح بہتا ہے تو وہ اُن پتھروں پر بیٹھ کر جو پانی کے چھینٹوں سے بھیگے رہتے ہیں، اپنی پیاس بجھالیتی ہیں ایسی جگہوں پر یہ آسانی سے پکڑی جاتی ہیں۔ بعض تالابوں میں جہاں مگر مچھ بھی ہوں بڑی ہوشیاری کی ضرورت ہے۔ ذرا پیر پھسلا اور مگرمچھ کے منہ میں!

بعض تتلیاں بہت اونچی ہوا میں اڑتی ہیں انہیں بڑی ترکیبوں سے نیچے لانا پڑتا ہے۔ گریٹ ہانگ کانگ آرینج ٹپ بڑی خوبصورت تتلی ہے۔ یہ بھی بہت اونچی اُڑتی ہے۔ اسے پکڑنے کے لئے میں نے یہ ترکیب کی کہ ایک کاغذ کی تتلی بنائی اُس کے پر تقریباً اسی طرح کے رنگ دئے اور اُسے ایک درخت کی نچلی شاخ پر باندھ دیا پھر جب اُسی قسم کی کوئی تتلی گذری تو میں نے اپنی تتلی کے تاگے سے اس طرح ہلا دیے کہ اصلی تتلی اس کے پاس اُتر آئی اور میں نے فوراً جال سے پکڑ لیا۔

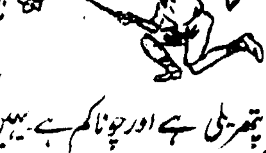
ایک دن میں نے ایسی جگہ سے بہت سی چیزیں پکڑیں جو بہت عجیب وغریب تھی۔ ہانگ کانگ کے قریب ساحل پر ایک طرف گھنا جنگل تھا اور ساحل کے قریب آکر بہت کم گنجان رہ گیا تھا۔ سمندر کا پانی اُتر رہا تھا اور بڑی خوبصورت تتلیاں پانی پینے کنارے کے پتھروں پر بیٹھی تھیں۔ کچھ اونچائی پر چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں اور بانس کے درخت تھے جہاں بہت سے کیڑے مکوڑے زمین پر رینگ رہے تھے اور اُڑ رہے تھے۔ یہاں میں نے بہت سے نئے نئے کیڑے جمع کئے۔



وہ پیر پھسلا!

گھر آیا تو ایک نقشہ دیکھ کر معلوم ہوا کہ اس جگہ خاص طور سے طاعون کے مریض دفن کئے جاتے تھے۔ ایسے موقع پر تم کیا کرتے!

کبھی کبھی خلاف امید جگہوں پر مجھے اچھی اچھی چیزیں ملی ہیں چین کے بے انتہا خشک پہاڑوں میں ایک چشمے پر مجھے پانی کے کئی کیڑے ملے، اسی طرح ایک چھوٹے سے تالاب میں جو پانی سے میلوں دور نہایت خشک جگہ پر تھا بہت سے کیڑوں کا پتہ چلا۔ مشرقی بالٹک کے علاقے میں عجیب متضاد چیزیں ملتی ہیں۔ خلیج فن لینڈ یعنی استھونیا کے علاقے میں جتنے گھونگے، سنکھ اور سیپیاں ملتی ہیں وہ بہت موٹی اور سخت ہوتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ یہاں کی زمین میں چونا بہت ہے لیکن چالیس میل کے فاصلے پر شمال میں فن لینڈ کی طرف یہی چیزیں بہت نازک اور پتلی ہوتی ہیں۔



بات یہ ہے کہ ادھر کی زمین پتھریلی ہے اور چونا کم ہے۔ یہیں مجھے اسقدر چھوٹے گھونگے ملے جو دس بارہ مل کر ایک مٹر کی برابر ہوتے ہیں۔ دھوپ میں اپنے سایہ کی وجہ سے وہ نظر بھی آ گئے۔ کم روشنی میں یا شام کے وقت ان کا ملنا محال تھا لیکن اگر تمہیں میمتھ (پرانے ہاتھی) کی ہڈیوں کی تلاش ہو تو یہ دقت نہ ہوگی۔ ایک بار ڈاکٹر ہرز ناکولیما کے علاقے سے ایک میمتھ لائے تھے۔ کیسے لائے تھے؟ یہ بھی سنو! اس جگہ سے ریل کا اسٹیشن کوئی



چار ہزار میل دور تھا اتنے بڑے جانور کا ایسی جگہ سے لانا جہاں ریل تو ریل سڑک کا بھی ہزاروں میل پتہ نہ ہو ناممکن تھا۔ اس لئے کیا یہ کہ اس کے ٹکڑے کر کے کئی سلیجوں (کتّے کی گاڑیوں) پر لادا اور ان سلیجوں میں کئی کئی کتے جوڑ کر یہ دور دراز فاصلہ طے کیا۔ جب میں خود شمالی سائبیریا میں میمتھ کے دانتوں کی تلاش میں گیا تھا تو میں ان کے وزن سے عاجز آ گیا۔ ایک دانت کا وزن دو آدمیوں کے وزن کے برابر تھا اور لمبائی بارہ بارہ فٹ مجھے ایک پرانی قسم کے گینڈے کے سر کے اوپر کا حصہ بھی ملا تھا اور ایک میمتھ کا نیچے کا جبڑا۔ وہ شیشے کی نلکیاں اور جال جن کے رکھنے کی میں نے تمہیں ہدایت کی تھی، یہاں کچھ بیکار ہی ثابت ہوئے۔

وہاں کے لوگوں کو یہ وہم وگمان بھی نہ تھا کہ میمتھ پرانے قسم کا ایک بہت بڑا ہاتھی ہے۔ وہ سمجھتے

کولیما کے باشندے میمتھ کو پرند سمجھتے تھے





لیکن اصل میں یہ ہاتھی کی ایک قسم ہے

تھے کہ یہ ایک بہت بڑا پرند ہوگا۔ یعنی اس قسم کا جس کا ذکر الف لیلہ میں ہے۔ ان کے دانتوں کو وہ اس پرند کے مڑے ہوئے پنجے سمجھتے تھے جن سے وہ بڑے جانوروں کو اٹھا لے جاتا تھا۔ ایک نیا خیال یہ ہے کہ وہ چھچھوندر کی قسم کا زمین کا بہت بڑا جانور تھا اور اس کا گلّہ کا گلّہ زمین کے اندر ہی اندر زمین کھودتا تھا۔ زلزلے اسی کی وجہ سے آتے تھے۔ جیسے ہی وہ زمین پر آتا تھا اور اس پر دھوپ پڑتی تھی تو مرجاتا تھا۔ میمتھ اکثر زمین میں آدھے دبے ہوتے ہیں اور اُس وقت نظر آتے ہیں جب مٹی میں برف پگھلنے سے سیلاب آتا ہے اور دریا کے کنارے کٹ جاتے ہیں۔

ایک بار جاپانی منچوریا کے علاقے میں عجیب دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ میں ساحل پر گھونگے جمع کر رہا تھا میرا کتا جیک بھی ساتھ تھا۔ جب میں جُھک کر کچھ اٹھاتا یا پتھر اٹھا کر کیڑے مکوڑے تلاش کرتا تو میرے بعد جیک بھی خوب زمین کھود کر گویا تحقیقات کرتا کہ میں نے کوئی ہڈی وغیرہ تو نہیں گاڑ دی۔ وہاں کے ماہی گیر اور ان کے بچے اپنے جھونپڑوں کے دروازے پر کھڑے ہوئے ہم کو دیکھا کرتے اور جب ہم آگے بڑھ جاتے تو وہ اپنی کدالیں لے کر آتے اور جہاں میں جُھکا تھا وہاں خوب کھود کر دیکھتے معلوم نہیں ان کا کیا خیال تھا۔ میں نے خزانہ دفن کیا ہے یا کسی کو مار کر دبا دیا ہے۔

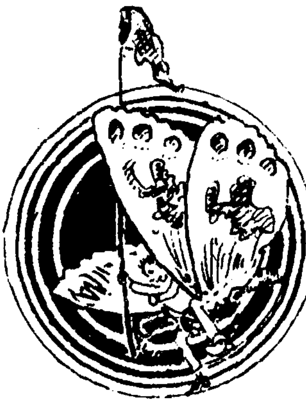




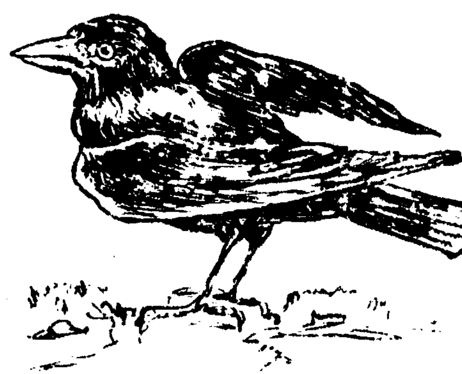




تمہیں کسی جگہ سانپ پکڑنے کا خیال ہو تو اُس جگہ کے لوگوں سے معلومات حاصل کرتے وقت یہ تو کرو کہ لوگوں کی باتیں خوب غور اور توجہ سے سُنو گے۔ اُن پر یقین نہ کرو جب تک تمہیں خود تجربہ نہ ہو جائے اس لئے کہ اُن میں مبالغہ بہت ہوتا ہے۔ ایک بار سُمبر یا میں میں بہت قابل اعتبار لوگوں سے ملا انھوں نے مجھے بتایا کہ یہاں کے سانپ بہت زہریلے ہوتے ہیں میں نے دریافت کیا اُنھوں نے کسی آدمی یا گائے یا گھوڑے کو کاٹا ہے۔ جواب ملا۔ نہیں میں نے پوچھا۔ پھر کیسے معلوم ہوا۔ انھوں نے کہا کہ اس طرح کہ وہ آدمی یا جانور کو دیکھ کر اپنی دُم پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور خوب پھنکارتے ہیں







چڑیا

جناب ڈاکٹر سعید احمد صاحب سعید بریلوی

چوں چوں کرتی آئی چڑیا	چونچ میں تنکا لائی چڑیا
پیچھے پیچھے چڑا بھی آیا	وہ بھی نیم کا تنکا لایا
چونچ سے اپنا اپنا تنکا	دونوں نے اک طاق میں رکھا
اب دونوں کا کام یہی ہے	صبح یہی ہے شام یہی ہے
اُڑ کر جانا تنکا لانا	گھونسلے میں اُس کو رکھ جانا
کھانا پینا شوق میں چھوٹا	گھر بن جائے چھوٹا موٹا
دیکھتے تھے ہر روز یہ ہم سب	گھر بن کر طیار ہوا جب
چڑیا انڈے دینے بیٹھی	انڈے دے کر سینے بیٹھی
چیں چیں چیں چیں، چیں چیں کرتے	ننھے ننھے بچے نکلے
کوا ان کو کھانے آیا	چڑیا نے غل شور مچایا
آیا لے کر دوڑیں پوّا	ڈر کے مارے بھاگا کوا
بچوں نے پھر اُڑنا سیکھا	چاروں طرف کو مُڑنا سیکھا
پھر پھر پھر پھر اُڑتے ہیں وہ	ڈال پہ دور سے گرتے ہیں وہ

بلّی

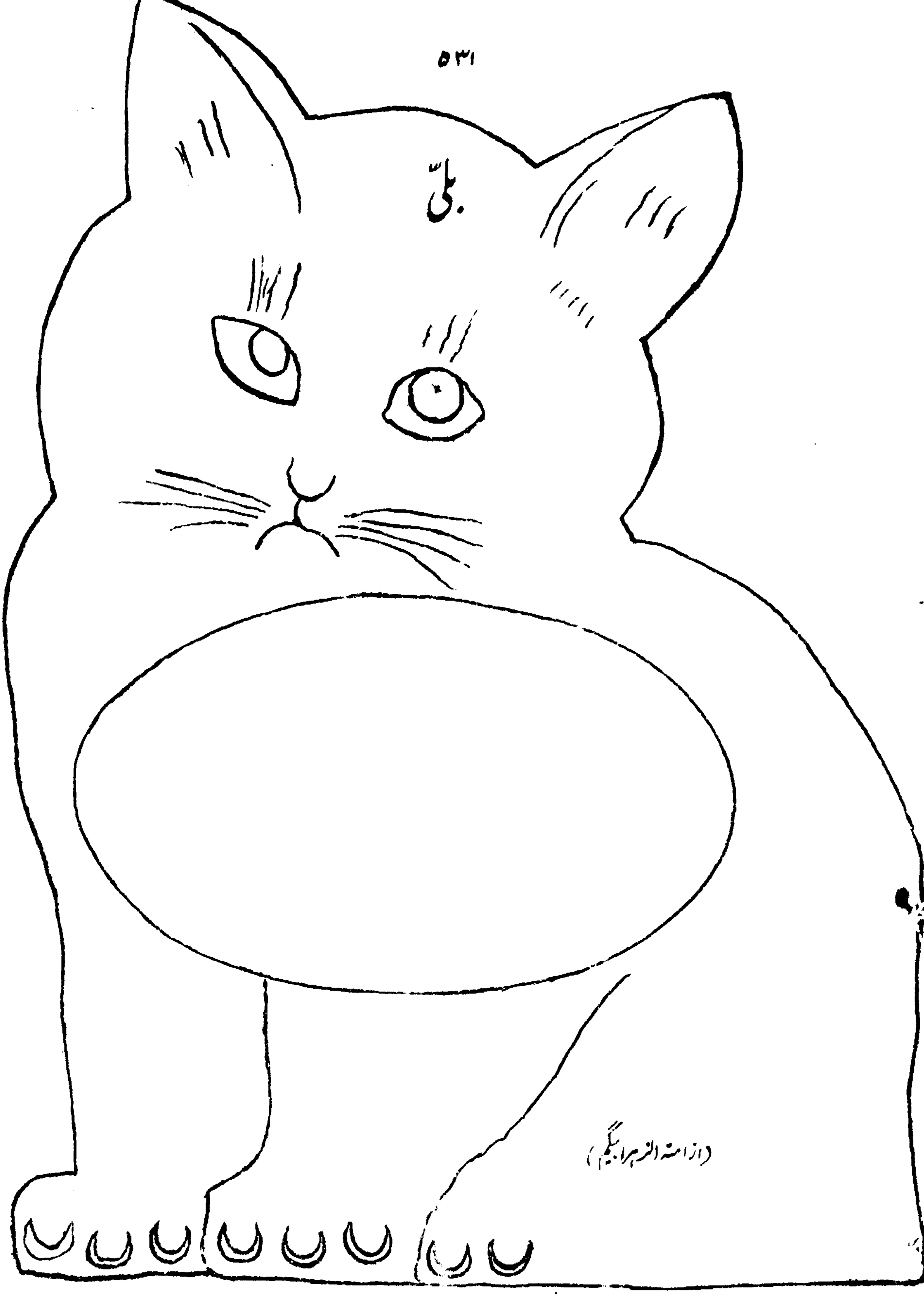
بلی کیسا پیارا مسکین جانور ہے۔ اس کی موہنی صورت رسیلی آنکھوں میں عجیب کشش ہے۔ بالو کو دیکھ کر بے اختیار پیار کرنے کو جی چاہتا ہے بہت سی بہادر بچیوں کے ہاں بلی پلی ہوگی اور وہ اسے بہت چاہتی ہوں گی لیکن وہ کبھی کبھی کھسوٹ بھی لیتی ہوگی اور بعض ایسی حرکتیں کرتی ہوگی جو ناگوار معلوم ہوتی ہوں گی اور دل یہی چاہتا ہوگا کہ اٹھا کر جنگل میں پھینک آئیں۔ ہم تمھیں ایک ایسی بلّی بنانے کی ترکیب بتاتے ہیں جو نہ نوچے گی نہ کھسوٹے گی۔ اگر تم اس کو ہدایات پر عمل کرکے محنت اور صفائی سے بناؤ گی تو اس میں ایسی ہی کشش ہوگی جیسی سچ مچ کی بلی میں جب دل چاہا کھیلے۔ نہیں تو اس کو کارنس پر یا میز پر کہیں رکھ دیا۔ کمرے کی آرائش ہوگی۔ کام لینا چاہو تو پن کشن بنالو۔ گرنے سے اس کی ٹانگ نہیں ٹوٹے گی۔ مارنے سے زخمی نہ ہوگی۔ البتہ دھواں دھوں لاٹھیوں سے نہ پیٹنا۔ کیوں کہ بے چاری بے قصور ہے۔ اس نے تمھارا دودھ بھی تو چرا کر نہیں پیا ہے۔

ضروری سامان

کھدر کریپ یا لٹھا پانچ گرہ۔ روئی دھنکی ہوئی آدھ پاؤ۔ ربن نصف انچ چوڑا آدھ گز۔ گھنگرو ایک عدد سوئی اور دھاگے۔

خاکے کو کپڑے پر ٹریس کرو۔ آنکھیں، منہ، کان، ناخن وغیرہ رنگین دھاگے سے کاڑھ لو۔ پھر آدھے انچ سلائی کا حق رکھ کر کاٹ لو اب نمونے کے تین ٹکڑے ہوں گے۔ سامنے کا اور پچھلا حصہ برابر رکھ کر (الٹی طرف) ہوشیاری سے کچا کرو۔ پھر مضبوط دھاگے سے بخیہ کرلو۔ اگر سلائی موٹی ہوگی تو روئی بھرنے پر چر جائے گی اور بدنما معلوم ہوگی۔ اب نچلا حصہ جوڑ لو۔ دو ڈھائی انچ بھرائی کے لئے چھوڑ دو۔ گولائی پر جہاں × ایسے نشان ہیں ذرا ذرا سا ترچھا کاٹ دو۔ تاکہ الٹنے پر گوشے صاف آئیں۔ سیدھا کرنے کے بعد خوب صفائی سے ٹھونک ٹھونک کر روئی بھرو۔ ایک گتے کا ٹکڑا نچلے حصے کے برابر کاٹ کر تلی میں رکھ کر شگاف کر دو۔ ربن میں گھنگرو ڈال کر گردن میں خوب صورت بو سے باندھ دو۔ لو بی بی! بلی تیار ہے۔

(از امۃ الزہرا بیگم)


بلّی
(از امۃ الزہرا بیگم)

کون کس کے پیچھے؟



اس تصویر میں مختلف آدمی اور جانور بے تحاشا بھاگ رہے ہیں مگر کون کس کے پیچھے؟ اس کا تو پتہ لگانا ہے ۔ یہ کام تم ہی کو کرنا ہے ان تصویروں کا پہلے کاغذ پر عکس اتار لو پھر تصویروں کو الگ الگ کاٹ لو ۔ اور تمھارے خیال میں جو جس کے پیچھے بھاگ رہا ہو اسے آگے پیچھے کر کے ایک کاغذ پر چپکا دو ۔ پہلا انعام اُسے ملے گا جس نے سب تصویریں ٹھیک لگائی ہوں ۔ دوسرا انعام سب سے کم غلطی کرنے والے کو ملے گا۔

اس حل کے ساتھ یہ کوپن بھی بھر دینا ۔ اگر یہ کاغذ نہ پھاڑنا چاہو تو کوپن کی نقل کر دینا۔

کوپن

نام .... عمر .... درجہ .... تصدیق ....

پورا پتہ ....

اپنی بچیوں سے کچھ کام کی باتیں

محترمہ شمسی عباد الرحمٰن صاحبہ

عرصے سے پیام بچیوں کو شکایت تھی کہ پیام تعلیم میں اُن کے کام کی باتیں کم ہوتی ہیں لہذا یہ چھوٹا سا مضمون اُن ہی کے لئے ہے اور امید ہے کہ وہ اسے پڑھ کر بہت سی مفید باتیں معلوم کرسکیں گی۔ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ جب سے ہمارے ملک کی لڑکیاں اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے لگی ہیں انھیں گھر کے کام کاج کرنے یا سیکھنے کا کچھ تو وقت ہی کم ملتا ہے اور کچھ وہ خود بھی ایسے کاموں کو ہاتھ لگانا پسند نہیں کرتیں۔ شاید وہ خیال کرتی ہیں کہ گھر کے کام دھندے کرنا آج کل کی پڑھنے لکھنے والی لڑکیوں کے لئے موزوں نہیں۔ یہ تو پرانے زمانے کی جاہل اور غیر مہذب عورتوں کا کام تھا لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو گھر کا کام عورت کے لئے ہر وقت اور ہر حالت میں ضروری ہے۔

لڑکی پڑھ لکھ کر چاہے سیّاح بنے یا ہوا باز، قوم کی خادم بنے یا اخباروں کی مضمون نگار لیکن گھر اور گھر کے کاموں سے اس کا کچھ ایسا تعلق ہے کہ اُن کی دیکھ بھال اسے ضرور ہی کرنا پڑتی ہے۔ اب اگر لڑکی ان کاموں میں سُگھڑ اور ہُنرمند ہے تو وہ بہت تھوڑے وقت اور کم روپے میں بھی اپنے گھر اور گرہستی کا سارا انتظام ایسی خوبصورتی سے کرسکتی ہے کہ اس کے سلیقے سے دیکھنے والوں کا جی خوش ہو۔ اور اس کی اور اس کے گھر والوں کی زندگی آرام و آسائش سے گذرے۔ اگر کوئی پھوہڑ یا گھرداری سے

سے لاپرواہ ہے تو یہ بات خود اس کے لئے بہت نقصان پہنچانے والی ثابت ہوتی ہے جس کا تجربہ اُسے رفتہ رفتہ ہوتا ہے۔ اس لئے جس طرح لکھنا پڑھنا بچپن سے سیکھنا ضروری ہے اسی طرح گھر بار کا انتظام، سینا پرونا، کھانا پکانا بھی چھوٹی عمر ہی سے سیکھنے پڑتا ہے۔ لیکن اس کام کے لئے بہت زیادہ محنت یا تکلیف اُٹھانے کی ضرورت نہیں۔ تھوڑی سی توجہ سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے مثلاً پڑھنے لکھنے یا اور کاموں سے جو وقت بچے تو گھر کے کاموں میں، بڑوں کا ہاتھ بٹایا کرو۔ جب کوئی کام سمجھ میں نہ آئے تو امی جان یا باجی سے پوچھ کر اُسے بہتر طریقے پر کرنے کی کوشش کرو۔ یہ نہیں کہ اکتا کر چھوڑ دو

مکان کی صفائی اور چیزوں کو قرینے سے رکھنے میں مدد دینا۔ اپنی کتابوں کو صفائی اور ترتیب سے رکھنا۔ اپنے کمرے کو سجانا۔ گل دانوں میں خوبصورتی سے پھول لگا کر رکھنا۔ کبھی اپنی سہیلیوں کو چائے یا کھانے پر بلایا۔ تو دو ایک مٹھائیاں یا کچھ اور اپنے ہاتھوں سے بنا لینا اپنے گرم اور ٹھنڈے کپڑوں کی دیکھ بھال، چھوٹے بہن بھائیوں کے لئے ننھے ننھے موزے بنیان وغیرہ بننا۔ گھر کے حساب کتاب میں امی جان کو مدد دینا۔ یہ سب ایسے چھوٹے چھوٹے کام ہیں جنھیں کرنے میں خاص دلچسپی بھی رہتی ہے۔ اور باتوں باتوں میں بہت کچھ سیکھ لیا جاتا ہے۔ پھر بڑے ہونے پر اس کا فائدہ معلوم ہوتا ہے۔ اپنے گھر کے کام کاج اپنے ہاتھوں کرنا کوئی بری بات نہیں۔ آرام اور فائدے کے علاوہ سمجھ دار لوگوں کی نظر میں عزت اور زیادہ ہوتی ہے۔ کتنی خوبی کی بات ہے کہ نوکر چاکر ہوتے ہوئے بھی اپنے ہاتھوں کام کرنا آدمی عار نہ سمجھے ذرا ذرا سے کام کے لئے خدمت گاروں کا محتاج رہنا بہت برا ہے ایک تو اس طرح آرام طلبی کی عادت پڑ جاتی ہے دوسرے گھر میں سینکڑوں ایسے چھوٹے چھوٹے کام ہیں جنھیں ایک سلیقہ مند عورت اچھی طرح کر سکتی ہے نوکر خواہ کتنا ہی ہوشیار کیوں نہ ہو نہیں کر سکتا۔

گھر بار کے کام میں کفایت شعاری

بھی ضروری چیز ہے۔ اور کفایت سے کام کرنا لڑکیوں کو شروع ہی سے سیکھنا چاہیئے۔ کیوں کہ اگر بچپن میں لڑکی فضول خرچ ہے اور بڑے ہونے پر خدانخواستہ اسے اتنی وسعت نہیں کہ جتنا روپیہ وہ پہلے خرچ کیا کرتی تھی اتنا ہی اب بھی کرے تو یہ بات اس کے لئے نہایت تکلیف دہ ہوگی اور اسے طرح طرح کی دقتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اسی لئے یہ بہتر ہے کہ بچیاں پہلے ہی سے ہر کام کو کفایت سے کرنے کی عادت ڈالیں۔ عید، بقرعید یا اور موقعوں پر جو روپیہ انھیں اُن کے خرچ کے لئے ملے اُسے والدین کی اجازت سے مناسب طریقے پر خرچ کرنا چاہیئے۔ یعنی ایسی چیزیں خریدیں جو کارآمد ہوں اور ایسے کاموں میں لگائیں جس سے کچھ فائدہ حاصل ہو۔ یہ نہیں خیال کرنا چاہیئے کہ روپیہ تو ہمارا ہے جو جی چاہے کریں۔ امی جان یا ابا جان سے اب کیا مطلب ؟ جو کام کریں بڑوں سے پوچھ کر کریں۔ اس طرح مشورے سے کام کرنے کی عادت پڑجاتی ہے اور دوسروں کی رائے معلوم کرنے سے بڑا تجربہ حاصل ہوتا ہے۔

آج کل کی پڑھی لکھی لڑکیوں میں اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ انھیں اپنی تعلیم پر کچھ غرور ہوجاتا ہے۔ اور اپنی سیدھی سادھی اَن پڑھ بہنوں سے ملنے جلنے میں اپنی توہین سمجھتی ہیں یہ بھی بہت بُری بات ہے۔ غرور خواہ کسی چیز کا ہو اچھا نہیں ہوتا۔ مغرور آدمی کبھی ترقی نہیں کرسکتا۔ کیوں کہ غرور اللہ کو بھلا نہیں معلوم ہوتا۔ انسان اگر کچھ سیکھے تو اس کا فرض ہے کہ وہ دوسروں کو سکھائے اپنے علم وہنر سے لوگوں کو فائدہ پہنچائے یہ نہیں کہ اپنے ہی اوپر نازاں ہوکر بیٹھ رہے۔ انکساری آدمی کے لئے بڑا جوہر ہے اس سے آپس کا میل جول عزت محبت اور ہمدردی قائم رہتی ہے۔ اور ایک اچھی لڑکی بننے کے لئے ان چیزوں کا ہونا بھی ضروری ہے

منشی پریم چند

محمد حسین حسان

منشی پریم چند آج جہانی اردو زبان کے بہت اچھے لکھنے والے تھے پچھلے سال کے سالگرہ نمبر میں ہماری درخواست پر انھوں نے تمہارے پیام تعلیم میں مضمون بھی لکھا تھا۔ ایک نئی دنیا بسائی تھی اور بتایا تھا کہ اس نئی دنیا میں کیا ہوگا یا کیا ہونا چاہئے اصل میں ان کا دل تمہاری طرف سے امیدوں سے بھرا ہوا تھا، وہ سمجھتے تھے اور ہمارے خیال میں ٹھیک سمجھتے تھے کہ جوان ہوکر تم اپنے وطن کے سپوت بنوگے۔ اپنے ہم وطنوں کے لئے ملک کو جنت کا نمونہ بنا دوگے۔

ویسے تو ہم سے اُن سے سال میں کئی بار خط کتابت ہوئی وہ خط کا جواب ضرور دیتے تھے۔ مگر جب اس سال گرہ نمبر کی ترتیب کا زمانہ آیا تو پہلے کی طرح ہم نے اُن سے پھر مضمون کی درخواست کی جواب نہ آنے پر دوسرا خط لکھا پھر تیسرا پھر چوتھا۔ اسی طرح کوئی سات آٹھ خط لکھ ڈالے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ منشی صاحب سخت بیمار ہیں۔ سخت شرمندگی اور رنج ہوا کہ کیوں ایسی حالت میں انھیں تکلیف دی گئی۔ ہم انھیں معذرت کا خط لکھنے ہی والے تھے کہ دو چار روز بعد اخبار میں ان کے مرنے کی خبر آگئی، مرنا، جینا تو سب کے ساتھ لگا ہوا ہے مگر بعض موتیں ایسی ہوتی ہیں۔ جن سے اپنے پرائے سبھی کو دُکھ پہنچتا ہے۔ منشی صاحب بھی ایسے ہی لوگوں میں تھے

تمھیں یہ سن کر تعجب ہوگا کہ منشی صاحب کا اصل نام دھنپت رائے ہے مگر اپنے افسانے، ناول اور مضمون ہمیشہ نواب رائے یا پریم چند ہی کے نام سے لکھتے رہے یہ آخری نام تو اتنا مشہور ہوا کہ لوگ یہی اُن کا اصلی نام سمجھنے لگے۔ منشی صاحب سنہ ۱۸۸۰ء (۱۹۳۷ سمت) میں ایک کائستھ خاندان میں پیدا ہوئے۔ اُن کا وطن بنارس کے پاس ایک گاؤں پانڈے پور ہے ان کے والد منشی عجائب لال ڈاک خانے کے محکمے میں ملازم تھے منشی صاحب نے اس زمانے کے دستور کے مطابق ۸ برس کی عمر میں فارسی پھر انگریزی پڑھنی شروع کی اور بنارس کالجیٹ اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد اپنی مجبوریوں کی وجہ سے وہ آگے تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رکھ سکے اور تعلیم کے محکمے میں نوکری کر لی۔ پڑھنے کا شوق تھا اس لئے نجی طور پر مطالعہ جاری رکھا کوئی بیس سال تک اس ملازمت کا سلسلہ رہا سنہ ۱۹۲۰ء میں اس غلام ملک کو آزاد کرانے کی تحریک بڑے زور شور سے شروع ہوئی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ موجودہ حکومت کا بائکاٹ کیا جائے اور اُسے اس کے کاموں میں مدد نہ دی جائے تاکہ وہ مجبور ہوکر ملک کو آزاد کر دے۔ بہت سے لوگوں نے نوکریاں چھوڑ دیں۔ منشی صاحب نے بھی بیس سال کی ملازمت پر لات ماری

اور پھر کبھی اس طرف رُخ نہ کیا۔

اب سے کوئی پچیس سال پہلے انھوں نے مضمون ناول اور افسانے لکھنے شروع کئے اُن کا پہلا ناول پریم کے نام سے آج سے ۲۳ سال پہلے شائع ہوا تھا اس کے بعد جلوۂ ایثار کے نام سے ایک اور ناول نکلا۔ اُن کی قابلیت کی دھاک اسی وقت سے بیٹھ گئی پھر تو انھوں نے اچھے اچھے افسانے اور ناول لکھے اور وہ ہماری اردو زبان کے سب سے بہتر افسانہ نگار سمجھے جانے لگے۔ یہ افسانے اور ناول انھوں نے محض دلچسپی کے لئے نہیں لکھے ہیں۔ اُن کے سامنے ایک خاص مقصد تھا۔ ہمارے ملک کے لوگ رسم و رواج کی بہت سی خرابیوں میں مبتلا ہیں۔ جن کی وجہ سے وہ ترقی نہیں کر سکتے اور دوسرے ملکوں کے مقابلے میں بہت پیچھے ہیں۔ ملک کی یہ حالت دیکھ کر منشی صاحب کا دل دُکھتا تھا۔ اور اپنے افسانوں کے ذریعے وہ لوگوں کو اُن کی بُرائیوں سے خبردار اور اُن سے بچنے کی تلقین کرتے تھے۔ بڑے ہو کر تم اُن کے ناول اور افسانے پڑھوگے تو تمھیں اُن کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوگا۔

منشی صاحب بڑے سیدھے سچے اور مخلص بزرگ تھے۔ اپنے وطن کی محبت سے ان کا دل بھرپور تھا، اُن کی ہمیشہ یہ آرزو رہی کہ ان کا دیس ترقی کرے ہندو مسلمانوں کی لڑائی سے انھیں دلی تکلیف ہوتی تھی۔ وہ ہمیشہ کوشش کرتے تھے کہ ہندو مسلمان دونوں بھائیوں کی طرح مل جل کر رہیں۔ جامعہ ملیہ سے انھیں اسی لئے محبت تھی کہ وہ ایک آزاد قومی یونیورسٹی ہے۔ اور اس قسم کے تعصب سے پاک دہلی آنا ہوتا تھا تو جامعہ میں ضرور تشریف لاتے تھے۔ اسی سال مارچ میں تشریف لائے تھے تو جامعہ ہی کے اہتمام میں انھوں نے ہندوستانی سبھا کے نام سے ایک انجمن قائم کی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ہندی اور اردو زبانوں کے لکھنے والے ایک دوسرے سے ملتے جلتے رہیں۔ تاکہ ایک دوسرے کے خیالات سے خبردار ہوں اور جو غلط فہمی دونوں کے درمیان آج کل پیدا ہوگئی ہے دور ہو جائے اور دونوں زبانیں ایک دوسرے کے قریب آجائیں۔ یہ انجمن بہت اچھا کام کر رہی ہے ابھی اکتوبر میں منشی صاحب کی تعزیت میں ایک جلسہ انجمن نے کیا تھا۔ اس میں یہ طے کیا گیا ہے کہ منشی صاحب کی یادگار میں مضمون اور افسانوں کا ایک انعامی مقابلہ ہر سال رکھا جائے یہ بہت اچھی یادگار ہے مگر بھائی ہمارا تو خیال ہے کہ منشی صاحب نے نئی دنیا والے مضمون میں جو اُمیدیں تم سے قائم کی ہیں اگر اُن امیدوں کو تم پورا کرسکے تو منشی صاحب کی اصلی یادگار تم ہو۔

پیام تعلیم کا اگلا پرچہ جنوری میں شائع ہوگا۔ اس پرچے کے لئے خاص انتظامات کئے جا رہے ہیں۔ اس میں ایورسٹ کی داستان۔ کنچن جنگا کی مہم کا باقی حصہ۔ ہوائی جہاز۔ لینن۔ ہمارے دیس کے درخت۔ بیج کا جادو (ڈراما) اور اچھے اچھے مضمون شائع ہوں گے۔ ہمارے ایک بزرگ ۱۹۳۶ء کے اہم واقعات پر ایک خاص مضمون لکھ رہے ہیں۔ یہ بھی اسی پرچے میں تصویروں کے ساتھ شائع ہوگا۔ ان کے علاوہ اور بہت سی نئی اور دلچسپ خبریں ہوں گی۔

(ایڈیٹر)

جمپر کا آسان گریبان

پہلے قمیص سی کر تیار کر لو اس کے بعد اس نقشے کو قمیص کے گریبان کے پاس اُتار لو۔ اگر کپڑا باریک ہے تو نیچے نقشہ رکھو اور اوپر کپڑا رکھ کر پنسل سے اتار لو۔ ورنہ کاربن پیپر جو ایک ایک پیسے کو بازار میں بکتے ہیں۔ منگا لو۔ اور جس جگہ گریبان اتارنا ہے۔ اس کے اوپر کاربن پیپر رکھ کر پھر یہ نقشہ اس پر رکھو۔ اور نقشے پر پنسل پھیرتی جاؤ۔ جب تمام پر پنسل پھیر چکو تو کاغذ ہٹا لو۔ نقشہ گریبان پر اُتر آئے گا۔ یہ واضح رہے کہ کاربن پیپر کا چکنا حصہ کپڑے کی طرف رہے

پھول۔ گلابی دھاگے سے

ڈنڈی اور پتی۔ سبز دھاگے سے

پھول کے بیچ میں جو ایسا ⬭ حصہ ہے اُسے زرد دھاگے سے کاڑھو اب تمھارا گریبان تیار ہو گیا۔ کیسا اچھا ہے

مسز صالحہ عابد حسین



نانی امّاں

جناب ڈاکٹر سعید احمد صاحب سعید بریلوی

بڈھی پھونس پرانی امّاں   میری اچھی نانی اماں
چٹّے چٹّے بال تمہارے   پچکے پچکے گال تمہارے
سر میں روپہلے تار لگے ہیں   کہیں کہیں دو چار لگے ہیں
لٹھیا ٹیکے اٹھ کر آئیں   میرے لئے کچھ میوہ لائیں
لیچی کے کچھ دانے چھیلے   جیسے انڈے گیلے گیلے
خوب کھلایا خوب پلایا   پیار کیا چھاتی سے لگایا
پھر دو چار دعائیں دے دیں   چٹ چٹ خوب بلائیں لے لیں

سب سے اماں جانی اچھی
اور ان سے بھی نانی اچھی

اِس سال کی اچھّی کتابیں

ایڈیٹر

اِس سال بچّوں کی کئی اچھی اچھی کتابیں نکلی ہیں آج ان میں سے چند پر تبصرہ (رائے) لکھتے ہیں باقی پر آئندہ پرچے میں لکھا جائیگا

ہماری بادشاہی

از مولوی عبدالسلام صاحب ندوی جامعی

مولوی عبدالسلام صاحب ندوی نے بہت اچھے انداز میں اختصار کے ساتھ مسلمانوں کی حکومت کی تاریخ لکھی ہے، اس میں شروع سے لے کر اب تک کی تمام اہم باتیں آگئی ہیں۔ زبان بہت صاف اور سادہ۔ بچّوں کے لئے مناسب۔ گر مختلف عہدوں کے نقشے بھی کتاب میں شامل ہوجاتے تو بچّوں کے لئے کتاب اور بھی مفید ہوجاتی۔ کتاب کی لکھائی چھپائی اچھی ہے۔ ضخامت کوئی ایک سو چوراسی صفحوں کی ہوگی۔ ایک روپے میں دارالمصنفین اعظم گڈھ سے مل سکتی ہے۔

نصابِ شہریت

یہ کتاب پروفیسر عطاء اللہ صاحب ایم۔اے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے مڈل اسکول کے بچّوں کے لئے لکھی ہے۔ اس میں تیرہ باب ہیں، پہلے باب میں بتایا ہے کہ شہریت کیا چیز ہے۔ دوسرے میں اسکاؤٹنگ کی تفصیل ہے تیسرے میں حکومت اور اس کی قسمیں بتائی ہیں۔ چوتھے میں بتایا ہے کہ شہریت کے حق کیا ہیں اور کیا فرائض ہیں۔ پانچویں میں ہندوستان کے انتظامی معاملات سے بحث کی ہے۔ مثلاً وزیر ہند وائسرائے گورنروں وغیرہ کے اختیارات کونسل آف اسٹیٹ، اسمبلی لیجسلیٹو کونسل پھر یہ کہ کس حیثیت کے لوگ کن کن مجلسوں کی ممبری کے امیدواروں کے انتخاب میں رائے دینے کا حق رکھتے ہیں۔ غرض اسی طرح پنچایت، حفاظت، عدالت، صحت، آبپاشی، قحط، صنعت و تجارت، ترقی تعلیم وغیرہ کے متعلق تفصیل سے معلومات ہیں۔ آخر میں لیگ آف نیشنز یا مجلس اقوام کا حال ہے، اس کتاب کے پڑھنے سے بہت ضروری اور مفید باتیں معلوم ہوسکتی ہیں۔ پروفیسر عطاء اللہ صاحب کوشش کرتے تو اس کی زبان بچّوں کے لئے اور بھی آسان اور دلچسپ ہوسکتی تھی۔ کتاب کوئی دو سو چھیالیس صفحے کی ہے اور قیمت صرف ۱۲ر قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور سے مل سکتی۔

برف کی بیٹی اور دوسری کہانیاں

جناب غلام عباس صاحب نے چند روسی کہانیوں کا ترجمہ کیا ہے۔ جو بچّوں کے لئے لکھی گئی ہیں۔ کہانیاں ہر قسم کی ہیں۔ اخلاقی بھی، مذاقیہ بھی، بہادری کے قصّے بھی ہیں۔ غلام عباس صاحب کو بچّوں کی زبان لکھنے کا خاص سلیقہ ہے۔ ان کی کہانیوں کی زبان بہت پیاری ہے، اور لکھنے کا انداز دلچسپ۔ البتہ ٹالسٹائی والی کہانی ذرا بڑی عمر کے بچّوں کے لئے مناسب تھی۔ کتاب کی لکھائی چھپائی بھی بہت اچھی ہے۔ کاغذ چکنا۔ سرورق پر برف کی بیٹی کی تصویر تین رنگوں میں۔ قیمت ۶ر

دارالاشاعت پنجاب لاہور سے مل سکتی ہے۔

چار چھوٹے ناٹک یہ کتاب بھی دارالاشاعت پنجاب سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں ایک ایکٹ کے چار ناٹک ہیں اور ملک کے مشہور لوگوں سے لکھوائے گئے ہیں۔ ننھی کی گڑیا، غلام عباس صاحب نے لکھا ہے۔ بور کا لڈو۔ محمد عمر، نورالٰہی صاحبان نے۔ میاں ظفر نکالے گئے۔ حسرت کشمیری صاحب نے۔ اور انوکھا دربار۔ خود امتیاز صاحب نے یہ ناٹک بڑے مزے کے ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ آسانی سے کھیلے بھی جاسکتے ہیں۔ زیادہ ساز و سامان کی ضرورت نہیں۔ ہر کھیل کے آخر میں کھیلنے والوں کے لئے ہدایتیں بھی ہیں۔ قیمت ۶؍ اوپر کے پتے پر مل سکتی ہے۔

مکتبہ جامعہ نے بچّوں کے لئے کہانیوں کا ایک سیٹ تیار کیا ہے۔ یہ چھ کتابیں ہیں **شیدلا** - **نیت کا پھل** - **بیکاری مرغی** **اجمیر علی** - **تانبیل خاں** اور **شہزادی گلنار**۔ ان میں پہلی چار کتابیں پہلے اور دوسرے درجے کے لڑکوں کے لئے لکھی گئی ہیں۔ تانبیل خاں تیسرے، اور شہزادی گلنار چوتھے درجے کے لئے۔

یہ کہانیاں کچھ تو ترجمہ ہیں اور کچھ لوگوں نے خود لکھی ہیں۔ ان کی زبان بہت ہی سادہ اور آسان ہے۔ لکھنے کے طریقے میں بھی ایک خاص رس اور انوکھا پن ہے۔ ہر کہانی کے سرورق پر کہانی سے متعلق اچھی اچھی تصویریں بھی ہیں۔ کہانیوں کی لکھائی چھپائی میں بھی بہت نفاست اور سلیقے سے کام لیا گیا ہے۔　　(مکتبہ جامعہ دہلی سے منگایئے)

جامعہ کیمکل انڈسٹریز کی بنائی ہوئی چند چیزیں

جامعہ میں سائنس کے شعبے کے اہتمام میں کیمکل انڈسٹریز کا کام ایک عرصے سے ہو رہا ہے۔ سائنس کے ایک قابل استاد اس کی نگرانی کرتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ سائنس کی نظری تعلیم کے ساتھ ساتھ بچوں کو عملی تعلیم بھی دی جائے۔ کام میں صفائی اور سلیقے کا خاص اہتمام ہے۔ جناب علی احمد صاحب نگراں معمل طبیعات نے جو چیزیں ہمارے پاس اظہار رائے کے لئے بھیجی تھیں ہم نے انھیں خود بھی استعمال کیا، دوسروں سے بھی کرایا اور بہت قابلِ اطمینان پایا۔

مفید منجن یہ منجن دانتوں کی صفائی ہی نہیں کرتا بلکہ مسوڑوں کے مختلف امراض اور پائیوریا کے لئے بھی مفید ہے اگر ابتدائی حالت میں ہو۔ اس میں اس قسم کی چیزیں ہیں جو دانتوں کو مضبوط بنائیں اور خراب جراثیم کو ہلاک کر دیں۔ بہت صاف خوشبودار خوش نما شیشیوں میں بند **قیمت** ۳؍

وسلین - یہ وسلین سائنٹفک طریقوں سے صاف کرکے اور بہترین قسم کی خوشبو ملا کر تیار کی گئی ہے۔ رنگ بھی بہت خوشنما بازاری وسلین سے تو لاکھ درجہ بہتر ہے چہرے اور بالوں میں ہمیشہ استعمال کرنے کی چیز ہے۔ **قیمت فی شیشی** ۳؍

مچھر بچاؤ تیل یہ تیل ایسے مرکبات سے تیار کیا ہے جن کی بو سے مچھر نفرت کرتے ہیں مگر یہ بو انسان کے لئے ناگوار نہیں۔ اس میں بعض ایسی چیزیں بھی شامل کی گئی ہیں جو جراثیم کو خون میں داخل ہونے سے روکتی ہیں۔ مچھروں اور ملیریا سے محفوظ رہنے کا آسان نسخہ ہے۔ تیل میں چکناہٹ برائے نام ہے **قیمت** چھوٹی شیشی ۱؍

جامعہ انک یہ روشنائی فاؤنٹن پن کے لئے ہے۔ اس کے استعمال سے فاؤنٹن پن ہمیشہ نیا رہتا ہے۔ روانی بھی خوب ہے رنگ بھی پختہ۔ ہم آج کل یہی روشنائی استعمال کر رہے ہیں **قیمت فی شیشی** ۳؍

یہ چیزیں کیمکل انڈسٹریز جامعہ ملیہ دہلی سے مل سکتی ہیں۔

محمد علی رننگ کپ

(از جناب چودھری اکبر علی صاحب نگراں مدرسہ ابتدائی۔ جامعہ نگر اوکھلا)

۱۔ محمد علی رننگ کپ کو جاری ہوئے پانچ سال ہو چکے ہیں اس عرصہ میں کافی مدرسوں نے دلچسپی کا اظہار کیا ہے پچھلے پانچ سال کے جلسوں پر غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ہم کو تعلیمی اور تربیتی نقطہ نظر سے اس میں چند تبدیلیاں کرنی چاہئیں جن کی تشریح یہ ہے۔

۲۔ ہمارے خیال میں تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ طالب علم کو اپنی خداداد قابلیتوں کے اظہار کا پورا پورا موقع دیا جائے اور ہمیشہ ایسے ذرائع اور وسائل مہیا کئے جائیں جن کی بدولت وہ تندرست خوش اور بامعنی زندگی گذار سکے اس لئے ضروری ہے کہ وہ تمام مواقع اور محرکات پیدا کئے جائیں جن سے طالب علم کی تمام امکانی خوبیوں کو ابھارنے اور چمکانے کی ضرورت پیدا ہو امید ہے کہ اس مقصد میں آپ ہماری ہمنوائی کریں گے اور اپنے تعاون سے حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔

۳۔ اس مقصد کے پیش نظر محمد علی رننگ کپ کے سلسلہ میں اس سال بعض جسمانی مقابلوں کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔

یہ ایک ضروری چیز ہے اس لئے میں جناب سے درخواست کرتا ہوں کہ اس مقابلے میں بھی اپنے نمائندے ضرور بھیجئے۔

تعلیمی مقابلے کے لئے ہم نے مندرجہ ذیل تین چیزیں منتخب کی ہیں

(۱) مشاہدہ - تیسری جماعت تک کے لئے۔

(۲) تقریر و تحریر - چوتھی سے آٹھویں جماعت تک

ذیل میں اساتذہ صاحبان اور مقابلہ میں شرکت کرنے والوں کی سہولت کے لئے۔ اس کی مختصر سی تشریح کرتے ہیں

ابتدائی سوم تک کے بچوں کے لئے:۔

پہلے بچے کو کوئی زندہ پرندہ یا جانور دکھایا جائے گا۔ اور اس کے متعلق سوچنے کے لئے مناسب موقع دیا جائے گا۔ اس کے بعد بچے کے سامنے اسی جانور یا پرندے کی تصویر مناسب ماحول اور منظر کے ساتھ پیش کی جائے گی۔ جس پر بچے سے بولنے کے لئے کہا جائے گا

مشاہدہ	نمبر ۲۵
بولنے کی صلاحیت	نمبر ۱۵
جدت طبع	نمبر ۱۰

اس سال چوتھی سے آٹھویں جماعت تک کے لڑکوں کا تقریری مقابلہ مناظرہ کی شکل میں نہ ہوگا کیونکہ ہم اس عمر میں بناوٹی لسانی اور زور خطابت مناسب نہیں سمجھتے۔ اس تصنع کو مٹانے اور بچے کے اصلی رجحانات کے اظہار کے لئے ہم نے تقریر کی ایک دوسری شکل سوچی ہے۔ مثلاً اسی سال ہم بچے کو دن کے کسی حصے کی سیر کرائیں گے۔ اور اس پر اس کے ذاتی تاثرات بصورت تقریر سنیں گے۔ ذیل کی خوبیوں کے بہ تفصیل ذیل نمبر دئے جائیں گے۔

۱۔	قوت مشاہدہ	۴۰
۲۔	قوت گویائی	۳۰
۳۔	رجحانات	۳۰

مقابلہ کرنے والے کے رجحانات سے مراد وہ نفسی تاثرات و

میلانات ہیں جن کو وہ کسی مسئلہ پر گفتگو کرتے وقت پیش نظر رکھتا ہے ۔ یعنی جب مقابلہ کرنے والے سے کسی خاص مسئلہ پر بولنے کے لئے کہا جائے گا ۔ تو یہ دیکھا جائے گا کہ وہ اس کو فنی، اخلاقی، جمالیاتی، تاریخی، ادبی وغیرہ کس نقطہ نظر سے دیکھتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو ۔ کہ مسئلہ زیرِ بحث کے متعلق مقابلہ کرنے والے کے ذاتی تاثرات کیا ہیں ۔ اور وہ کس پہلو سے اس کی وضاحت کرنا چاہتا ہے ۔

تحریری مقابلہ میں بھی ہمارے پیش نظر اول الذکر مقابلہ کی طرح یہی ہے ۔ کہ بجائے بچوں کے حافظہ کا امتحان لینے کے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جائے ۔ کہ بچے میں قوت تحریر کس درجہ تک موجود ہے ۔ اسی خیال کے ماتحت ہم نے یہ طے کیا ہے ۔ کہ بچے کو کسی چیز کے متعلق معلومات دے جائیں گے اور اس سے یہ کہہ دیا جائے گا ۔ کہ اس کے متعلق کچھ لکھو ۔ یا کئی چیزیں دکھلائی جائیں گی اور ان میں سے کسی ایک پر لکھنے کو کہا جائے گا ۔

تحریری مقابلے کے نمبر :-

۱ - صحت زبان ۳۰

۲ - خیالات و تاثرات ۳۰

۳ - معلومات ۴۰

جسمانی مقابلہ :-

اس مقابلہ کے لئے سردست حسب ذیل کھیل رکھے گئے ہیں ۔ اس مرتبہ حصہ لینے والے مدرسوں کے اساتذہ صاحبان سے مشورہ کرکے آئندہ کے لئے اس میں کچھ اضافہ کیا جائے گا ۔

۱ - سو گز کی دوڑ ۲۵ نمبر

۲ - لمبی چھلانگ ۲۵ نمبر

۳ - کراس کنٹری ریس (۳ میل کی دوڑ) ۳۰ "

(۴) امدادی دوڑ (ریلے ریس) ۲۰ نمبر

ٹرافی حاصل کرنے کے لئے جسمانی مقابلہ بھی لازمی ہے ۔ تعلیمی اور جسمانی ہر دو مقابلوں کے مجموعی نمبروں کے حاصل کرنے پر ٹرافی کا دارومدار ہوگا ۔

حصہ لینے والوں کی تعداد :-

تعلیمی مقابلہ کے تین حصے ہیں ہر ایک حصے میں ایک ایک علیحدہ طالب علم کا شریک ہونا لازمی ہے ۔ جن مدرسوں میں تیسری جماعت کی تعلیم کا انتظام نہیں وہ آٹھویں جماعت تک کے طلبہ میں تحریر و تقریر کے لئے دو طالب علم بھیج سکتے ہیں جسمانی مقابلہ میں ایک طالب علم زیادہ سے زیادہ دو چیزوں میں حصہ لے سکتا ہے ۔ یہ طالب علم خواہ تعلیمی مقابلہ میں حصہ لینے والے ہوں یا علیحدہ سے ۔

نوٹ :- شہر دہلی کے باہر کے حصہ لینے والوں کے قیام و طعام کا انتظام مدرسہ ابتدائی کی طرف سے ہوگا ۔

نیاز مند

اکبر علی نگراں مدرسہ ابتدائی جامعہ نگر اوکھلا دہلی ۔

محمد علی رننگ کا پروگرام حسب ذیل ہے :-

۱۴ نومبر ۳۶ء سنیچر ۹ بجے صبح سے ۱۲ بجے تک بڑے لڑکوں کا تقریری مقابلہ ۔

۲ - ۳ بجے سے ۵ بجے شام تک ورزش کا مقابلہ

۱۵ نومبر ۳۶ء اتوار (۱) ۹ بجے صبح سے ۱۲ بجے تک چھوٹوں کا تقریری مقابلہ و تقسیم انعامات ۔

(۲) ۳ سے ۵ تک ہاکی اور والی بال کے نمائشی مقابلے ۔



کوپن

نام .... عمر .... درجہ .... تصدیق ....

پورا پتہ :- ....

لوٹ :- اس تصویر کے پیچھے قصداً ایسا مضمون رکھا گیا ہے۔ جسے الگ کرنے سے کوئی نقصان نہ ہوگا۔ اس لئے تم بلاتکلف اس ورق کو علیحدہ کرلو۔